تو انھیں اپنے اسی نوشتہ کو نوٹ کر لینے کی ہدایت کر دیتے تھے، ان ہی مختصر نوٹس کو اب کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، آخر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج کی تفصیل اور بعض دوسری اہم ہدایات بھی اسی میں شامل کر دی گئی ہیں، جن سے حج کی تمام ضروری باتیں اس مختصر رسالہ کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں، امید ہے کہ یہ رسالہ عوام و خواص دونوں میں پسند کیا جائے گا،

شعلۂ نوا - از تلوک چند محروم، صفحات ۲۷۸، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت ہے؍

تلوک چند محروم اس دور کے مسلّم اساتذہ میں ہیں، اس سے پہلے ان کے کلام کے چار پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، یہ مجموعہ ان کی زندگی کے تیسرے دور یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کے کلام پر مشتمل ہے، وہ غزل کی جدید صالح قدروں کے قدر دان ہیں مگر وہ جدید شعراء کی قلمی انارکی اور بے راہ روی کو ناپسند کرتے تھے۔

آزاد قید و بند سے ہیں اہل فن — پابند یعنی کوئی کسی بات میں نہیں
جو جس کے جی میں آئے لکھے اور چھاپ دے — کچھ فرق شعر اور خرافات میں نہیں

ان کا کلام تعارف و تبصرہ سے مستغنی اور استادانہ پختگی کا نمونہ ہے، امید ہے کہ اصحابِ ذوق میں ان کے دوسرے مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی مقبول ہوگا،

"م، ج"

جلد ۹۸ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء عدد ۳

مضامین

شذرات

نواب ناظر یار جنگ مرحوم ہماری پرانی بزم کی یادگار تھے، اس کی ساری خوبیاں اُن میں جمع تھیں، وہ ایک بڑے باپ مولوی نظام الدین حسن مرحوم کے فرزند، خود حیدر آباد ہائیکورٹ کے جج اور اپنے اوصاف کے اعتبار سے بڑے آدمی تھے، وہ علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور کے اولڈ بوائے تھے، اب شاید ہی ان کا کوئی معاصر زندہ ہو، اور آخر تک ان کو اس سے وابستگی رہی، مدتوں مسلم یونیورسٹی کورٹ اور اکزیکیٹیو کونسل کے ممبر اور اسکے کاموں میں عملی حصہ لیتے رہے، ججی کے عہدہ سے عرصہ ہوا رٹائر ہو چکے تھے، اور اپنا وقت حیدر آباد کے قومی و ملی کاموں میں صرف کرتے تھے، دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن اور اس کے ہمدرد و ہوا خواہ تھے، ان سب سے بڑھکر وہ عملا مرد مومن تھے، انکی موت سے ایک پرانی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

اخوان المسلمین کے مشہور رہنما سید قطب اور انکے تین ساتھیوں کو ناصر کے خلاف سازش کے جرم میں پھانسی دیدیگئی اور دوسرے لیڈروں کو مختلف میعاد قید کی سزائیں دیگئی ہیں، جن میں بعض عورتیں بھی ہیں، یہ کوئی خلاف توقع خبر نہیں، ناصر مختلف حیلوں سے اخوان کو ختم کر دینے پر تل گئے ہیں، حجاز میں ان پر ناصر کے وحشیانہ مظالم کے جو واقعات معلوم ہوئے تھے اُن کو سنکر الجزائر کے مسلمانوں پر فرانس کے مظالم کی یاد تازہ ہوگئی تھی، یہ وہ دینی شخصیتیں تھیں، جن کے بارہ میں کسی سازش کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن اعلاء کلمۃ اللہ کی تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، بہت سے اصحاب دعوت و عزیمت کو اس راہ سے گذرنا پڑا ہے، گو یہ واقعہ ساری دنیائے اسلام کے لیے المناک ہے، لیکن سید قطب اور ان کے رفقا شہید فی سبیل اللہ کے درجۂ عالی پر سرفراز ہوئے اور دعوت و عزیمت کی تاریخ

میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہو گیا، اللہ تعالیٰ ان شہدائے حق پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔
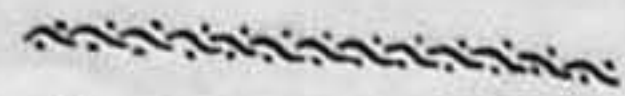
نہر سویز پر ناصر کے قبضہ کے بعد انکی پوزیشن نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ پورے ایشیا میں بلند ہوگئی تھی، لیکن الحاد و بے دینی کی راہ میں ان کی تیزروی اور عرب ملکوں کی قیادت کے جنون میں انھوں نے ایسی ایسی حرکتیں شروع کر دیں کہ رفتہ رفتہ ان کا اثر ختم ہونے لگا، اور اب ان کی ڈکٹیٹری صرف قوت اور سی آئی ڈی کے سہارے قائم ہے، اور وہ اپنے ملک میں بھی جہاں انکی مقبولیت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، حفاظت کے خاص اہتمام کے بغیر نہیں نکل سکتے، اسلامی ملکوں میں جہاں جہاں انھوں نے قدم بڑھایا ہر جگہ ناکامی ہوئی، حتی کہ وہ اسرائیل کے مقابلہ کے لیے بھی عربوں کو متحد نہ کر سکے جو ان کی ناکامی کی سب سے بڑی دلیل ہے، اب ان کا عروج ختم اور زوال شروع ہو چکا ہے،
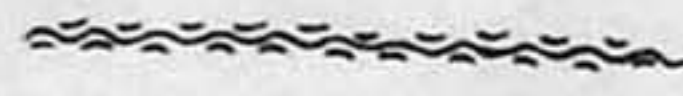
مغرب زدہ طبقہ تو بے دینی اختیار کر سکتا ہے، لیکن جبر سے پوری قوم کو بے دین نہیں بنایا جا سکتا، ترکوں کی مثال سامنے ہے، ایک زمانہ میں معلوم ہوتا تھا کہ ترکی سے اسلام کا خاتمہ ہے، لیکن کمال پارٹی کے زوال کے ساتھ ہی اسکا زور بھی ختم ہو گیا، اور آج بھی ترک مسلمان ہیں اور پہلے سے زیادہ اچھے مسلمان، اس سال پچیس (۲۵) ہزار ترک حج کیلیے آئے تھے، ان میں بہت اونچے طبقے کے بھی ترک تھے، اس سے ناصر کو سبق حاصل کرنا چاہیے، اور مصر تو قبۃ الاسلام ہے، وہاں آج بھی دین زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گا،
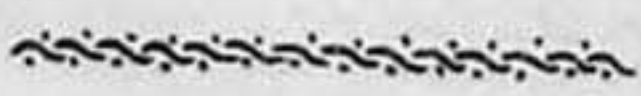
اس صوبے میں اردو کے ساتھ حکومت کے رویہ سے اتنی مایوسی ہو چکی تھی کہ ہم نے اس مسئلہ پر لکھنا ہی چھوڑ دیا تھا، مگر اب مرکزی حکومت نے اس کی طرف توجہ کی ہے، صدر جمہوریہ کی زبان پر بھی اردو کا ذکر خیر آیا ہے، مسٹر کامراج نے مسز اندرا گاندھی اور صوبہ بہار کے وزیر اعلیٰ سے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے، اور اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ سے گفتگو کرنے والے ہیں، اس سے امید کی ہلکی کرن نظر آئی ہے، مگر محض صلاح و مشورہ سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا، وزراء حضرات

زبانی اردو سے ہمدردی کا اظہار کردیں گے، اس کی حمایت میں بیان بھی دیدیں گے، ممکن ہے بعض رعایتی احکام بھی جاری کر دیے جائیں، مگر یہ سب ٹالنے کی باتیں ہوں گی، جب تک خود صدر جمہوریہ اپنے حکم سے اردو کی حیثیت اور اس کا درجہ متعین نہ کر دیں، یا اسمبلی میں اس کے متعلق قانون نہ بن جائے، محض زبانی ہمدردی سے کچھ حاصل نہ ہوگا، جس کا تجربہ برسوں سے ہو رہا ہے، الیکشن کے قریب اس قسم کے تماشے بہت ہوا کرتے ہیں، اور اگر مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں یہ کام انجام پاگیا تو دن کا تاریخی کارنامہ ہوگا جو ہمیشہ یاد رہے گا،

معارف کے گذشتہ نمبر میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ اس سال دارالمصنفین کی کئی نئی کتابیں شائع ہونگی، ان میں سے دو کتابیں ہندوستان سے متعلق حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین کا مجموعہ "مقالات سلیمان" جلد اول اور صباح الدین صاحب کی کتاب "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" چھپ کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں، راقم کی کتاب "دین رحمت"، قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم کی تصنیف "صاحب مثنوی" ڈاکٹر محب الحسن صاحب کی انگریزی کتاب تاریخ کشمیر کا اردو ترجمہ مترجمہ علی حماد عباسی صاحب اور صباح الدین صاحب کی دوسری کتاب "عہد مغلیہ ہند و مسلم مؤرخین کی نظر میں" چھپ رہی ہیں جو انشاء اللہ اس سال کے آخر تک شائع ہوجائینگی،

اس سال حکومت نے عربی کی سند کا اعزاز ہمارے محترم بزرگ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کو عطا کیا ہے، مولانا کی علمی خدمات اتنی مسلم ہیں، خصوصاً کلام مجید کی تفسیر ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ یہ اعزاز ان کو بہت پہلے ملنا چاہئے تھا، مولانا کی ذات اب اس قسم کے اعزازات سے بلند ہے، اسلئے ان سے زیادہ خود حکومت اس حق شناسی پر مبارکباد کی مستحق ہے، فارسی کا اعزاز ہمارے لائق دوست قاضی سجاد حسین صاحب پرنسپل مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی کو ملا ہے، جو اسکے بجا مستحق تھے، انھوں نے فارسی کی کئی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں،

مقالات

میراسفر حج

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۳)

مسجد نبویؐ اور بارگاہ نبویؐ کے اثرات وکوائف

مسجد نبویؐ خانہ کعبہ کے بعد دنیا کی ساری مسجدوں سے اور روضۂ پاک کی سرزمین ساری دنیا سے افضل ہے، یہ وہ بارگاہ قدس ہے جہاں قدم رکھتے ہوئے بڑے بڑے صلحاء واخیار امت کے حواس گم ہو جاتے ہیں،

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

جب ان نفوس قدسیہ کا یہ حال ہے تو گنہگار کس شمار میں ہیں؛

اللہ تعالیٰ تو سمیع و بصیر ہے، ہر جگہ موجود ہے، اس کے لیے غیب و شہود برابر ہے، اس پر کسی بندہ کا حال خواہ وہ کہیں بھی ہو پوشیدہ نہیں ہے، لیکن خانہ کعبہ اس کی خاص جلوہ گاہ ہے، اس لیے یہاں گناہوں کا احساس ہونا تعجب انگیز نہیں، مگر حضورؐ کی آنکھوں سے امت کے اعمال پوشیدہ ہیں، اور یہ بھی یقین ہے کہ آپ قبر انور میں حواس باطنی کے ساتھ تشریف فرما ہیں، لوگوں کی حاضری کو محسوس فرماتے صلوٰۃ وسلام سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں، اس لیے آستان پاک پر حاضری کے وقت اس خوف سے کہ آپ پر ساری بد اعمالیاں منکشف ہو جائیں گی، اور آپ کے سامنے پہلی مرتبہ رسوائی ہوگی،

گناہوں کا احساس اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، جس سے بچنے کے لیے اقبال نے بارگاہ خداوندی میں التجا کی ہے،

تو شہنشاہ دو عالم من فقیر | روز محشر عذرہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر | از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اس خوف سے آلودۂ عصیاں قدم آگے نہیں بڑھتے، دوسری طرف روضۂ پاک کی کشش اور حضوری کی تمنا اپنی طرف کھینچتی ہے، اور کشمکش کی عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر حضور کی ذات پاک سراسر رحمت ہے، وما ارسلناک الا رحمۃ للعلمین کے جلوے آج بھی حرم شریف میں اسقدر نمایاں ہیں کہ چشم ظاہر سے ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، یہ رحمت خود بڑھ کر دستگیری کرتی ہے، شفاعت کی حدیثیں تسلی دیتی ہیں کہ بڑے سے بڑا گنہگار آپ کی مقبول شفاعت سے محروم نہ رہے گا،

(۱) من زار قبری وجبت لہ شفاعتی — جس نے میری قبر کی زیارت کی، اسکے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی

(۲) شفاعتی لاھل الکبائر — میری شفاعت بڑے گنہگاروں کے لیے ہے،

(۳) شفاعتی لاھل الذنوب من امتی وان زنا وان سرق — میری شفاعت گناہگاروں کے لیے ہے، خواہ انھوں نے زنا اور چوری جیسے گناہ کبیرہ کیے ہوں،

زسرتا بپا رحمتی یا محمد
نظر جانب ہر گنہگار داری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما — اور وہ لوگ جنھوں نے (گناہ کر کے) اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے، اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت والا پاتے۔

(نساء - ۹)

گنہگاران امت اسی توبہ و استغفار کیلیے آستان نبوی پر حاضر ہوتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ضرور پورا ہوگا، اس سے دل کو ڈھارس بندھتی ہے، رکے ہوئے قدم آگے بڑھنے لگتے ہیں (مواجہ شریف) میں پہنچکر پھر متضاد کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، ایک طرف جالیوں کی طرف نظر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی،

کس آنکھ سے دیکھیں انھیں ہمت نہیں پڑتی
وہ مصحف رخ پاک ہے آلودہ نظر ہم

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم | گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

دوسری طرف دل چاہتا ہو کہ بس ٹکٹکی باندھے دیکھا کیجئے، پلک جھپکانا بھی گراں گزرتا ہے،

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا | نظارہ ز جنبیدن مژگان گلہ دارد

اس کشمکش میں کبھی نظر اٹھتی ہے کبھی جھکتی ہے لیکن صلوٰۃ و سلام پیش کرنے کے بعد یہ کیفیت دور ہو جاتی ہے اور ایسا سکون ہو جاتا ہے جیسے شیر خوار بچہ اپنی ماں کی آغوش شفقت میں پہنچ گیا

تہجد کی نماز کے بعد سے لیکر عشاء کے بعد تک صلوٰۃ و سلام پیش کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، خصوصاً پانچوں نمازوں کے بعد اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ کھڑے ہونے کی جگہ ملنا مشکل ہو جاتا ہے، ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق صلوٰۃ و سلام پیش کرتا ہے، اور وجد و بیخودی کا عجیب عالم نظر آتا ہے، اس بیخودی میں ناواقف لوگ حد ادب کا بھی لحاظ نہیں رکھتے، جہاں بلند آواز سے بولنا اور روضۂ مبارک کے قریب جانا حد ادب کے خلاف ہے، کشمکش سے باز نہیں آتے، ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں، جالی کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں، گو یہ بھی محبت اور ذوق و شوق ہی کا مظہر ہے لیکن خلاف ادب ہے۔

یوں تو بہت سے صلوٰۃ وسلام ہیں جن کو پڑھنے والے اپنے ذوق کے مطابق پڑھتے ہیں، لیکن ہم ہندوستانیوں کو اصل لطف اردو اور فارسی کے صلوٰۃ وسلام میں آتا ہے، اس لیے عربی کے صلوٰۃ وسلام کے بعد اس کو ضرور پڑھنا چاہیے اور لوگ پڑھتے بھی ہیں، راقم عربی کے صلوٰۃ وسلام کے بعد ملا واعظ کاشفی کا یہ سلام

بہ سلام آمدم جوابم دہ — مرہمے بر دلِ فگارم نہ
بس بود جاہ و احترام مرا — یک علیک از تو صد سلام مرا
خواہم از شوق پائے بوس تو کرد — پاے بیروں کن از یمانی برد
سویم افگن ز مرحمت نظرے — باز کن بر رخم بلطف درے
زاریِ من شنو تکلم کن — گریۂ من نگر تبسم کن
لب بجنباں پئے شفاعتِ من — منگر بر گناہ و طاعتِ من
گرنہ رفتم طریق سنت تو — ہستم از عاصیانِ امتِ تو
رحم کن بر من و فقیری من — دست دہ بہرِ دستگیری من

اور خواجہ فریدالدین عطار کی نعت

یا رسول اللہ بسے درماندہ ام — باد بر کف خاک بر سر ماندہ ام
بیکساں را کس توئی در ہر نفس — من ندارم در دو عالم جز تو کس
یک نظر سوئے منِ غمخوارہ کن — چارۂ کارِ منِ بیچارہ کن
اے شفاعت خواہ مشتے تیرہ روز — لطف کن شمعِ شفاعت بر فروز
تا چو پروانہ میانِ جمع تو — پر زناں آیم بہ پیشِ شمعِ تو

اور اسی قبیل کے اور دوسرے اشعار پڑھا کرتا تھا۔

کبھی کبھی مغرب اور عشا کے درمیان جب مجمع کم ہو جاتا تھا، پائین مبارک میں بیٹھ کر مولانا جامی کی یہ مشہور نعت پڑھتا تھا

ز مہجوری برآمد جانِ عالم — ترحم یا نبی اللہ ترحم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی — ز محروماں چرا غافل نشینی
برون آور سر از برد یمانی — کہ روئے تست صبح زندگانی
شب اندوہ ما را روز گرداں — ز رویت روز ما فیروز گرداں
جہانے دیدہ کردہ فرش راہ — چو فرش اقبال پابوس تو خواہند
ز حجرہ پائے در صحنِ حرم نہ — بفرقِ خاک رہ بوساں قدم نہ
بدہ دستے ز پا افتادگاں را — بکن دلداری دلدادگاں را
اگرچہ غرقِ دریائے گناہیم — فتادہ خشک لب بر شاہراہیم
تو ابر رحمتی آں بہ کہ گاہے — کنی بر حال لب خشکاں نگاہے
بخود درماندہ ام از نفس خود رائے — ببیں درماندہ چندیں بخشائے
اگر نبود ز لطفت دستیاری — ز دست ما نیاید ہیچ کارے
قضا افگندہ اندر راہ ما را — خدا را از خدا در خواہ ما را
کہ بخشد از یقیں اول حیاتے — دہد آنگہ بکار دیں ثباتے
چو ہول روز رستا خیز خیزد — بہ آتش آبروے ما نریزد
کند با ایں ہمہ گمراہی ما — ترا اذن شفاعت خواہی ما

بحسن اہتمامت کار جامی
طفیل دیگراں یابد تمامی

مواجہ شریف اور پائین مبارک میں اس قسم کے اشعار پڑھنے میں بڑی کیفیت ہوتی ہے اور دل کو محسوس ہوتا ہے کہ حضورؐ اس التجا اور زاری کو سن رہے ہیں اور اس کو قبول فرما رہے ہیں)

مسجد نبویؐ کی کیفیت اور اسکے آثار شریف

مسجد نبویؐ کی عمارت اس حیثیت سے سادہ ہے کہ اس میں ظاہری شکوہ و بلندی اور گل بوٹوں کی نقش آرائی نہیں ہے، اس کے بجائے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے کتبات اور طغرے مرقوم ہیں، جو خطاطی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، عمارت اتنی وسیع ہے کہ کئی ہزار آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں، نئے اضافہ کو چھوڑ کر مسجد کی اصل عمارت میں ڈھائی سو سے زیادہ ستون ہیں، اس سے اس کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پرتو جمال نے اس میں اتنی رعنائی اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ اس کو دیکھنے سے سیری نہیں ہوتی۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

اس کی فضا میں ایسی رحمت، سکینت اور کیفیت ہو کہ یہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا، رات کی روشنی میں چراغاں کا منظر ہوتا ہے، بجلی کے قمقموں اور بڑے بڑے جھاڑوں اور فانوسوں کی روشنی سے پوری مسجد بقعۂ نور بنجاتی ہے۔

مسجد اور اس کے آس پاس کا پورا حصہ عہد سعادت کی پوری تاریخ ہے، قبر اطہر تو حجرۂ عائشہؓ میں ہے، اسی سے متصل حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کا مکان تھا، اس کے بالمقابل مسجد کے دوسرے کنارہ پر خوخۂ ابوبکرؓ تھا جس پر کتبہ لگا ہوا ہے، اسی سے متصل حضرت عباسؓ کا مکان تھا، جو مسجد میں شامل ہو گیا ہے، مختلف ستون مثلاً اسطوانۂ مخلقہ، اسطوانۂ عائشہ، اسطوانۂ توبہ، اسطوانۂ وفود، اسطوانۂ علی، اسطوانۂ تہجد وغیرہ مختلف واقعات سے منسوب ہیں، جن کی تفصیل طویل ہے، ان پر یہ نام کندہ ہیں، یہ سب اسطوانے متبرک ہیں، یہاں لوگ نوافل پڑھتے ہیں، ایک ستون پر کھجوروں کا خوشہ بنا ہوا ہے، یہ اس کی

علامت ہو کہ یہاں کھجور لٹکا دیے جاتے تھے، جن کو غریب صحابہ توڑ توڑ کر کھاتے تھے، مسجد نبوی میں کھجور کے دو تین اور پیتل کے درخت بھی رکھے ہوئے ہیں،

اصحاب صفہ کا چبوترہ مسجد کے اندر آگیا ہے، جس کو پیتل کے کٹہرے سے گھیر دیا گیا ہے، اس پر مسجد کے خدام بیٹھتے اور دوسرے لوگ نوافل پڑھتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، روضۂ جنت کو سنگ مرمر کے ستونوں سے ممیز کیا گیا ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجایش ہوگی، مگر یہاں عبادت کی بڑی فضیلت ہے، اس کے لیے لوگوں کی بڑی کشمکش رہتی ہے، اور بڑی مشکل سے جگہ ملتی ہے، اور جب کو مل جاتی ہے وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتا جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ کسی کو دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ بیٹھنے دیا جائے تاکہ ہر شخص کو موقع مل سکے، یہی حال محراب نبوی پر کشمکش کا ہوتا ہے، یہاں بھی کسی کو چار رکعت نفل سے زیادہ پڑھنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے، تاکہ ہر شخص کو آسانی سے نوافل کی سعادت حاصل ہو سکے، پائین مبارک کے قریب مقام جبرئیل ہے، جہاں اکثر وحی نازل ہوتی تھی،

مسجد نبویؐ کی اصل عمارت اور عہد بعہد کے اضافوں کو ستونوں کے ذریعہ دکھایا گیا ہے، لیکن یہ سب ترکوں کے قائم کردہ نشانات ہیں، موجودہ حکومت کا کام تو آثار کو مٹانا ہے، روضۂ نبوی کی دیوار پر چاروں طرف تھوڑی بلندی پر قصیدہ بردہ کے کچھ اشعار لکھے ہوئے تھے، ان میں جو شعر اہل نجد کے عقیدے کے خلاف تھے، ان کو روغن پھیر کر مٹا دیا گیا ہے، ایک منظر اور تکلیف دہ ہے، روضۂ نبوی کی اندرونی دیوار پر ریشمی غلاف چڑھانے کی رسم بہت پرانی ہے، جو ترکوں کے زمانہ تک برابر قائم رہی، جب غلاف پرانا ہوتا تھا تو بدل دیا جاتا تھا، موجودہ غلاف اتنا بوسیدہ ہو گیا ہے کہ اس کے چیتھڑے جالی مبارک سے نظر آتے ہیں، جس کو دیکھ کر آنکھوں کو تکلیف ہوتی ہے، یا تو اس غلاف کو اُتار کر دیواروں کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے یا پھر نیا غلاف چڑھا دیا جائے، اگر موجودہ حکومت خود

ایسا نہیں کرتی تو وہ اس کی اجازت دیدے، بہت سے مسلمان اس سعادت کے حصول کے لیے
تیار ہو جائیں گے،

باب جبریل کی سمت مسجد نبوی سے باہر حضرت امام حسنؓ حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت
عثمان غنیؓ اور عشرہ مبشرہؓ کے مکانات تھے، جواب باقی نہیں رہ گئے ہیں، ان کی جگہ دوسرے مکانات
بن گئے ہیں یا افتادہ زمین ہے، حضرت حسنؓ کے مکان کی جگہ کتب خانہ شیخ الاسلام کی عمارت ہے،
جو ایک اچھی یادگار ہے، اگر اسی طرح سب بزرگوں کے مکانات میں یادگاریں قائم کردیجائیں یا کم
ان پر کتبے لگادیے جائیں تو زائرین ان کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کرلیں، اس میں کوئی مذہبی
قباحت بھی نہیں ہے، موجودہ گمنامی کی شکل میں تو جب تک کوئی بتانے والا نہ ہو کسی کو اس کا علم ہی نہیں ہو سکتا،

مدینہ طیبہ کے دوسرے آثار و مشاہد

مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و نواح میں چپہ چپہ پر عہد نبوی کے آثار بکھرے ہوئے
ہیں، جن کو دیکھ کر اس عہد مبارک کی پوری تاریخ نگاہوں کے سامنے آجاتی
ہے اور زائرین ان کو دیکھکر دل شاد اور آنکھیں روشن کرتے ہیں، ان آثار میں زیادہ تر مساجد ہیں،
جو ان واقعات کی یادگاریں بنادی گئی ہیں، مختصر قیام میں ان سب پر حاضری کا موقع نہ مل سکا، تاہم
مولوی عبد اللہ صاحب میمنی کی مہربانی سے ان کی معیت میں مسجد قبا، مسجد قبلتین، مسجد فتح اور
مزار سیدنا حمزہؓ اور دوسرے شہدائے احد کے مزارات پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، قبا،
مدینہ منورہ کا ایک محلہ ہے، مدینہ تشریف آوری کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے چند دن
یہیں قیام فرمایا تھا، اور اس دوران میں ایک مسجد تعمیر فرمائی تھی، جو مسجد قبا کہلاتی ہے، اس لحاظ
سے یہ مدینہ کی پہلی مسجد ہے، کلام مجید میں اس کی فضیلت آئی ہے، مسجد قبلتین، اس مسجد میں تحویل قبلہ
کا حکم ہوا تھا، اور بیت المقدس کے بجائے مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو قرار دیا گیا، چنانچہ موجودہ
مسجد میں بھی اصل قبلہ تو بیت اللہ کی جانب ہے اور بیت المقدس کے سمت کے قبلہ کا نشان دیوار

بنا ہوا ہے، مسجد فتح غزوۂ خندق کی یادگار ہے، اس مقام پر آنحضورؐ نے کئی دن تک کفار پر فتح کی دعا
مانگی تھی، اسی سے متصل تین اور مسجدیں ہیں جو حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کیجانب منسوب ہیں،
راقم نے اول الذکر تینوں مساجد میں نفل پڑھی، مسجد قبا کے قریب ہی بیر خاتم ہے، جس میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی گرگئی تھی، یہ کنواں شکستہ حالت میں ابھی تک باقی ہے،
حضرت حمزہؓ غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے، اس کے قریب ان کا اور دوسرے شہدا کے
مزارات ہیں، جو بہت اچھی حالت میں ہیں، ان کے گرد ایک بڑی اور غالباً نئی چہار دیواری ہے،
جس میں پھاٹک لگا ہوا ہے، چہار دیواری کے بیچ میں ایک چھوٹے سے حصار کے اندر حضرت
حمزہؓ اور بعض دوسرے بزرگوں کی قبروں کی جگہ نشان کے پتھر رکھے ہوئے ہیں، اسی کے قریب
ایک احاطہ میں شہدائے احد کا گنج شہیداں ہے، جگہ بہت صاف ستھری ہے، جو لوگ یہاں
آتے ہیں تبرکاً کھجور خرید کر کھاتے ہیں،)

جنت البقیع

ان تمام آثار میں سب سے اہم جنت البقیع کا قبرستان ہے جہاں اہل بیت کرامؓ،
بہت سے صحابۂ عظامؓ اور بے شمار ائمۂ اسلام و صلحاء و اخیار امت آرام فرما ہیں، ان میں چند بڑی
اور مقدس ہستیوں کے سوا اب کسی کی قبر کا نشان تک باقی نہیں ہے، پہلے جنت البقیع کی ویرانی
اور ابتری کے جو حالات سننے میں آئے تھے، اب وہ نہیں ہیں، قبے تو بلاشبہ ڈھادئے گئے ہیں،
پختہ قبریں بھی زمین کے برابر کردی گئی ہیں، لیکن صفائی کا پورا انتظام ہے، کہیں ملبے کا ڈھیر یا گندگی
نظر نہیں آئی، مقبروں کی جگہ پتھر کے معمولی حصار ہیں، جو غالباً مقبروں کے باقیات میں ہیں اور قبروں
کی جگہ نشان کے لیے بے گڑھے پتھر ڈال دیے گئے ہیں، پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے
ایک چبوترے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھیوں کی قبریں ہیں، اس کے آگے تھوڑی بلندی پر
ایک حصار میں اہل بیت کرام میں حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت امام حسنؓ، امام زین العابدین،

امام جعفر صادق، امام باقر رضوان اللہ علیہم کے مزارات ہیں، مگر سپاٹ زمین اور منتشر پتھروں میں پتہ نہیں چلتا کہ کون کس کی قبر ہے، اس سے آگے اسی طرح کے حصاروں میں ازواج مطہراتؓ بنات طاہرات اور فرزندان ارجمند کے مزارات ہیں، قریب ہی حضرت عباسؓ کا بھی مزار ہے، اس سے آگے امام دار الہجرۃ حضرت امام مالکؒ اور انکے شیخ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے نامور غلام نافع کی قبر ہے، اس کے بعد ان شہدائے احد کے مقابر کا احاطہ ہے جو جنگ احد میں زخمی ہوئے تھے اور اس کے صدمہ سے وفات پا گئے، سب سے آخر میں قبرستان کے دوسرے کنارے پر ایک پختہ چبوترے پر جو گنبد کے باقیات میں ہے، حضرت عثمانؓ کا مزار ہے، اس سے نیچے اتر کر دوسرے کنارے پر حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی قبر ہے، ان کے علاوہ بہت سے اکابر صحابہ، سیکڑوں علماء و ائمہ اور ہزاروں برگزیدہ ہستیاں اس خطۂ پاک میں آسودۂ خواب ہیں، جن کی قبروں کا نشان بھی باقی نہیں، یا بعض اور معلوم قبریں ہوں جن کا راقم کو علم نہ ہو سکا، اگر معلوم شکستہ قبروں کو شرعی حدود کے اندر قبر بنا دیا جاتا اور ان پر کتبے لگا دیے جاتے تو یہ مقدس آثار محفوظ ہو جاتے اور حاضرین کو متعین طور پر ان کا پتہ نشان معلوم ہو جاتا جن کو دیکھ کر وہ آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے، لیکن اب غالباً متعین طور سے ان قبروں کا علم بھی کم لوگوں کو ہوگا، کم سے کم ان پر کتبے لگا کر سب کے نام لکھ دیے جائیں تو اشک شوئی کے لیے اتنا بھی کافی ہے،

مدینہ کی آبادی کے اندر ایک قبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد حضرت عبد اللہ کی بتائی جاتی ہے، اسی سے تھوڑے فاصلہ پر ایک اور بڑے صحابی کا مزار ہے، جن کا نام نہیں یاد رہ گیا، ان دونوں پر ترکوں کے زمانہ کی عمارتیں قائم ہیں، لیکن ان کو بند کر دیا گیا ہے، مولوی عبد اللہ صاحب میمنی کی بدولت باہر سے ان کی بھی زیارت نصیب ہوئی،

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، عموماً واقعات کی یادگاریں مسجدیں بنا دی گئی ہیں جو ترکوں کے زمانہ کی ہیں، ان میں سے بعض خاصی وسیع ہیں، لیکن زیادہ تر بہت چھوٹی ہیں اور بوسیدہ بھی ہو گئی ہیں، غالباً

سعودی حکومت ان کی مرمت بھی کراتی ہے، اگر ان کی جگہ نئی خوبصورت مسجدیں بنا دی جائیں تو یہ حکومت کی ایک اچھی یادگار ہوگی،

مدینہ یونیورسٹی

ایک دن کھڑے کھڑے مدینہ یونیورسٹی بھی گیا جو شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، دور سے غزوۂ احزاب کی خندق کے آثار کی زیارت ہوئی، یونیورسٹی کے بعض اساتذہ اور ہندوستانی طلبہ سے ملاقات ہوئی، یہ درس کا وقت تھا، درجوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، گو ایسی طائرانہ نظر میں کسی چیز کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن مدینہ یونیورسٹی کے نام سے جو تخیل لیکر گیا تھا وہ پورا نہ ہوا، عمارتیں بھی معمولی درجہ کی ہیں جن کی حیثیت ہمارے یہاں کے انٹر کالج کی عمارتوں سے زیادہ نہیں ہے، معلوم ہوا کہ یہ عارضی ہیں، مستقل عمارت بننے والی ہے، بعض عمارتیں بن بھی رہی ہیں، ابھی اس یونیورسٹی کی حیثیت ہندوستان کے متوسط درجہ کے عربی مدارس سے زیادہ نہیں ہے، سنا ہے کہ ساٹھ لاکھ ریال اس کا سالانہ خرچ ہے، یعنی ہندوستانی سکہ کے حساب سے دو کروڑ روپیہ کے قریب، ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو، لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس کے پاس روپئے کی کمی نہیں ہے، اگر اس کو صحیح طریقہ سے صرف کیا جائے تو مدینہ یونیورسٹی صحیح معنوں میں یونیورسٹی بن سکتی ہے، ابھی اس کی ابتدا ہے، امید ہے کہ آئندہ ترقی کرے گی، اس وقت اس یونیورسٹی میں مختلف ملکوں کے ساٹھ طلبہ ہیں، سعودی حکومت ہر اسلامی ملک سے ہر سال چند طلبہ لیتی ہے اور ان کو ڈھائی سو ریال ماہانہ وظیفہ دیتی ہے، وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں کے اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کرتی ہے، ہمارے ندوی فاضل مولانا ناظم صاحب بھی چند سال ادب کے استاد رہ چکے ہیں، جو کسی ہندوستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے، اس وقت بھی بعض ہندوستانی اساتذہ ہیں، اس سے مختلف اسلامی ملکوں کے علماء میں ربط پیدا ہوگا جو علمی دینی اور سیاسی ہر حیثیت سے بہت مفید ہے،

تعلیم کی طرف حکومت کی بڑی توجہ ہے، پوری تعلیم تقریباً مفت ہے، حکومت طلبہ کیلئے ہر قسم کی سہولت

فراہم کرتی ہے، لیکن ابھی عربوں میں تعلیم کا پورا ذوق پیدا نہیں ہوا ہے، ترکوں کے دینی جذبہ، دینی خدمات اور بہت سے احسانات کے باوجود ان کا یہ بڑا جرم ہے کہ انھوں نے عربوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اپنے مصالح کی بنا پر ان کو محض حرمین کا مجاور بنا کر رکھا، جس کے نتائج اب تک ظاہر ہو رہے ہیں، لیکن امید ہے کہ حکومت کی توجہ سے رفتہ رفتہ تعلیم کا ذوق ہو جائے گا۔

مکہ اور مدینہ میں جلال وجمال کے مظاہر

عام طور پر مشہور ہے کہ مکہ جمال وجلال دونوں کا مظہر ہے اور مدینہ صرف جمال ورحمت کا، یہ شہرت محض عوامی شہرت نہیں بلکہ حقیقت ہے، جس کو ہر شخص محسوس کرتا ہے، اور یہ فرق فطرت کے عین مطابق ہے، اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم بھی ہے اور جبار وقہار بھی، تواب وغفار بھی ہے اور منتقم بھی، اور انسانی اصلاح وتربیت کے لیے دونوں قسم کے صفات کی ضرورت ہے، اسکے بغیر انسانی اصلاح وتزکیہ نہیں ہو سکتا، اور ایمان کے لیے خوف ورجا، دونوں کا ہونا ضروری ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو خود اللہ تعالیٰ نے سراسر رحمت بنایا ہے، وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ میں رحمت کے جو معنی بھی لیے جائیں اس میں رحمت ظاہری یعنی لطف وکرم ضرور شامل ہوگا۔ کلام پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں اُن سب میں، رحمت ہی کا مفہوم ہے

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ
عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ
عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ
(آل عمران)

تمھارے پاس ایک پیغمبر تشریف لائے جو تمھاری ہی جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمھاری نقصان کی بات بہت شاق گذرتی ہے جو تمھارے فائدے کے بڑے خواہشمند ہیں، خاص طور سے ایمان والوں کے ساتھ بڑے شفیق ومہربان ہیں۔

آپ میں سختی اور درشتی کا شائبہ بھی نہ تھا، خود کلام مجید نے اس کی تردید کی ہے،

فَبِمَا رَحْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ
وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ فَاعْفُ
عَنْھُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَھُمْ
(آل عمران - ۱۷)

یہ اللہ ہی کی رحمت کے سبب سے ہے کہ آپ ان (مسلمانوں) کے لیے نرم دل ہیں، اگر آپ تند خو اور سخت مزاج ہوتے تو وہ آپکے پاس سے منتشر ہو جاتے بس ان کو معاف کر دیجئے، اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کیجئے۔

رحم دلی، نرم خوئی، عفو وکرم وغیرہ رحمت کے مختلف مظاہر آپکے خاص اوصاف ہیں، احادیث کی کتابیں آپ کے خلق ورحمت اور لطف وکرم کے واقعات سے معمور ہیں، آپ کی زندگی میں ایک واقعہ بھی سختی ودرشتی کا نہیں مل سکتا، اس لیے رحمت کا یہ فیضان آپ کے بعد بھی جاری ہے، اور اسکا اثر مدینہ طیبہ کے ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے اور لطف وکرم سے قدرۃً دل کو زیادہ انس ہوتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے جس طرح وہ مکہ میں ہے اسی طرح ساری دنیا میں ہے لیکن رسولؐ کی ذات پاک تو مدینہ ہی میں ہے، جو آج بھی اپنی ساری رحمتوں اور شفقتوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس لیے قدرۃً مدینہ سے جو انس محسوس ہوتا ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہو سکتا، اس کی وضاحت اس مثال سے ہوگی، استاد کی تنبیہ وتادیب بچوں کی بھلائی کیلیے ہوتی ہے، اسی سے اس کی زندگی سنورتی ہے، "جور استاد بہ ز مہر پدر" مشہور مقولہ ہے، لیکن بچہ کو جو لطف وسکون ماں کی آغوش میں ملتا ہے وہ درسگاہ میں نہیں حاصل ہوتا، اس سے استاد اور مدرسہ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، وہ اپنی جگہ مسلّم ہے، سوال صرف انس ومحبت کا ہے۔

مدرسہ صولتیہ

مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی اہم دینی یادگار ہے، اس کو مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے جن کی شخصیت تعارف سے مستغنی ہے، آج سے تقریباً ایک صدی قبل کلکتہ کی ایک مخیر خاتون صولت النسا بیگم کی مالی امداد سے قائم کیا تھا،

اس کا فیض اب تک جاری اور روز افزوں ہے، اس کے موجودہ ناظم مولانا محمد سلیم صاحب کے دور میں مدرسہ کو بڑی ترقی ہوئی ہے، متعدد نئی عمارتیں بن گئی ہیں، ایک وسیع دار الاقامہ زیر تعمیر ہے جس کی عمارت قریب قریب مکمل ہو چکی ہے، کتب خانہ بھی خاصہ وسیع ہے، مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخوں کی بھی بڑی تعداد ہے، جن میں بعض نادر کتابیں بھی ہیں، اس کتبخانہ کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا،

مولانا سلیم صاحب کی شخصیت میں بڑی کشش ہے، بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج ہیں، طبیعت ایسی باغ و بہار پائی ہے کہ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھے ہم اور ان کی باتیں سنتے رہیے، سیری نہیں ہوتی، جب تک مدرسہ صولتیہ میں میرا قیام رہا روزانہ ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا تھا، جس دن نہ جا سکتا تو خود مولانا کو تلاش ہوتی،

مدرسہ صولتیہ حج کے زمانہ میں ہندوستانی حجاج کے لیے جائے پناہ ہے، جن کا کہیں ٹھکانا نہیں ہوتا ان کو یہاں جگہ مل جاتی ہے، حج کے زمانہ میں سیکڑوں آدمی مدرسہ کی عمارت میں ٹھہرتے ہیں، مدرسہ کا ایک بڑا کار خیر حجاج کی امانتوں کی حفاظت کا انتظام ہے، جو حاجی جتنا روپیہ چاہے جمع کر سکتا ہے، اس کی رسید مل جاتی ہے، پھر جب جتنا چاہے نکال سکتا ہے، اس کا باقاعدہ حساب و کتاب درج رجسٹر ہوتا رہتا ہے، اس سے حاجیوں کو بڑی سہولت ہوتی ہے، اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا، حسبۃً للہ یہ کام کیا جاتا ہے، مولانا کے بڑے صاحبزادے شمیم میاں بھی اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر ہیں،

تبلیغی جماعت تبلیغی جماعت کے کام ایسے نمایاں اور اظہر من الشمس ہیں کہ ان کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، جس کا عینی مشاہدہ راقم کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ہوا، تبلیغی جماعت کے ایک رکن رکین افتخار فریدی صاحب کا قیام بھی مدرسہ صولتیہ میں تھا، وہ مجھ پر اتنا لطف و کرم فرماتے تھے کہ میرا زیادہ وقت ان ہی کے پاس گذرتا تھا، ان کی ذات تبلیغی کاموں کا مرکز تھی، تبلیغی جماعت کے اجتماعات اور باہر جانے والے وفود کا نقشہ ان ہی کی نگرانی میں بنتا تھا، اس لیے ان سب کاموں کو دیکھنے کا بہت قریب سے موقع ملا جس سے ان کی وسعت کا پورا اندازہ ہوا اور اقبال کے ان اشعار

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں ... کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے ... بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

کا منظر نگاہ کے سامنے آگیا،

اس زمانہ میں اس عالمگیر دعوت و تبلیغ کی حامل صرف تبلیغی جماعت ہے جس کے وفود ایشیا افریقہ، یورپ، امریکہ اور چین و جاپان تک رواں دواں رہتے ہیں، اور یہ سارا کام کسی پروپگنڈے کے بغیر نہایت خاموشی کے ساتھ ہوتا ہے، نہ رسائل و اخبارات میں اس کا اعلان کیا جاتا ہے اور نہ اس کی رپورٹ کہیں چھپتی ہے، مبلغین فی سبیل اللہ کام کرتے ہیں، نہ کسی سے چندہ لیتے ہیں اور نہ کسی پر اپنے مصارف کا بار ڈالتے ہیں، سارے مصارف خود برداشت کرتے ہیں، جس کی نظیر اس زمانہ میں نہیں ملتی، اس لیے اس تاریک دور میں اس جماعت کی حیثیت قندیل رہبانی کی ہے، راقم اپنے مشاغل کی وجہ سے عملاً تبلیغی جماعت میں شرکت نہ کر سکا لیکن دل میں اس کے کاموں کی ہمیشہ سے عظمت تھی، اس مشاہدہ و تجربہ کے بعد اس سے اور زیادہ قربت ہو گئی ہے،

افتخار فریدی صاحب کی شخصیت بڑی پرکشش، فعال اور سراپا عمل ہے، تبلیغ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، ہر وقت اسی کی دھن میں لگے رہتے ہیں، اسی کے ساتھ تبلیغی اوصاف و اخلاق سے بھی آراستہ ہیں، میرے ساتھ انھوں نے بغیر کسی سابقہ تعلق کے جو اخلاق برتا، اس نے مجھ کو ان کا گرویدہ بنا لیا، اس سلسلہ میں مولانا سعید صاحب کا ذکر بھی ضروری ہے، ان کی جیسی

سادگی، اور خاموشی میں نے کم لوگوں میں پائی، وہ مکہ میں تبلیغی جماعت کے امیر اور کئی سال سے
وہاں مقیم ہیں، ان کی بعض باتیں اب تک دل پر نقش ہیں، ایک موقع پر ایک جماعت سے
جو کہیں باہر جا رہی تھی فرمایا کہ "تبلیغی وفود کا مقصد محض دوسروں کی رہنمائی نہیں بلکہ خود اپنی
اصلاح ہے، جس کے بغیر تبلیغ نہیں ہو سکتی، جہاں تبلیغ غیر موثر ہو سمجھنا چاہیے کہ اپنی خامی کا نتیجہ
اس لیے پہلے اپنی اصلاح ضروری ہے" یہ بات اگرچہ نئی نہیں ہے لیکن اس وقت دل کو لگ گئی
اس کا احساس بہت کم حلقوں کو ہوتا ہے، بلکہ جو حلقے جس قدر دینی اور روحانی کہلاتے ہیں،
ان میں اپنے تدین و تقویٰ کا اتنا پندار ہوتا ہے کہ اس دائرے کے باہر کے مسلمانوں کو گمراہ
یا کم سے کم دیندار نہیں سمجھتے، ان کے یہاں دینداری کا معیار کسی حلقہ یا کسی مرشد سے انتساب ہے
عمل میں اوراد و وظائف کو زیادہ اہمیت دیجاتی ہے، اخلاق و معاملات کی جو دین کی اصل روح
ہیں، زیادہ اہمیت نہیں، مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی جماعت کے خاص رکن ہیں
جو عرصہ سے حجاز میں تبلیغی کام انجام دے رہے ہیں۔

بعض رفقائے حج

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بہت سے پرانے احباب مل گئے اور بعض نئے احباب سے
ملاقات ہوئی، ہمارے محترم دوست مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور ندوی عزیز مولوی عبد العلیم صاحب
استاد جامعہ ملیہ ہندوستان کے خیرسگالی وفد میں گئے تھے، سید عبد الوہاب صاحب بخاری بھی جو پہلے
سے حج کے لیے آئے تھے، اس وفد میں شامل ہو گئے تھے، قاضی اطہر صاحب مبارکپوری سے اکثر
اور مولوی عثمان احمد صاحب جونپوری سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی، مولانا فخر الحسن صاحب استاد
دار العلوم دیوبند اور مولانا حامد حسن صاحب سابق استاد دینیات جامعہ عثمانیہ مدرسہ صولتیہ میں
ٹھہرے تھے اس لیے ان سے برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی، مولانا طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی
رفاقت منیٰ سے عرفات تک حاصل رہی، مولانا یوسف صاحب بنوری اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری

سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی تھی، ہندوستانی سفارت خانے کے فضل الرحمن صاحب ضرورت کے وقت
مدد دینے کے لیے تیار رہتے تھے، ہمارے پرانے رفیق شاہ محی الدین صاحب قادری دریابادی مدرسہ
صولتیہ ہی میں مقیم تھے، انھوں نے کاکل دراز مشائخ کی وضع قطع ایسی اختیار کر لی ہے کہ ان کو پہچاننے میں
دشواری ہوتی ہے، ہمارے جوار کے شیخ عبد الرؤف صاحب قدوائی، اعظم گڑھ کے
علاء الدین صاحب مختار اور لکھنؤ کے محمود الحسن صاحب سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی،

بعض اکابر سے ملاقاتیں

میں نے خود کسی سے ملنے ملانے کی کوشش نہیں کی، مگر مختلف موقعوں
پر حجاز اور اسلامی ملکوں کے بہت سے اصحاب علم سے ملاقات ہو گئی، مگر ان کے نام نوٹ
نہیں کیے تھے، اس لیے اکثروں کے نام بھول گئے، جو نام یاد رہ گئے اُن میں سے بعض کے نام
اوپر گذر چکے ہیں، مدینہ یونیورسٹی کے کئی اساتذہ سے ملاقات ہوئی، ان میں صرف عبد القادر شیبۃ الحمد
کا نام یاد رہ گیا، افغانستان کے مشہور ملائے شور بازار کئی سال سے مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں،
ان سے دو مرتبہ تفصیلی ملاقات ہوئی، دیر تک افغانستان کے انقلاب کے حالات سناتے رہے، جن
لوگوں سے میں ملا اُن میں ایک نقشبندی بزرگ مولانا عبد السلام صاحب سے دل بہت متاثر ہوا، ان میں
قدیم صوفیائے کرام کے اخلاق و تواضع کی تصویر نظر آئی، ان کے اخلاق میں اتنی کشش ہے کہ کوئی
انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ایک دن راقم اور مولانا حامد حسن صاحب کو دعوتِ طعام
سے سرفراز فرمایا تھا،

بعض تجربات

سفر حج میں دو بڑے تجربے ہوئے جن کا لکھنا ضروری ہے، شاید اس سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے،
ایک تو جہاں تک ہو سکے جوانی میں یا کم سے کم قویٰ کمزور ہونے سے پہلے ضرور حج کر لینا چاہیے، ورنہ زحمت
اٹھانا پڑتی ہے، بہت سے کاموں میں صرف جسمانی قوت کام دیتی ہے، پیسوں سے کام نہیں چلتا،
بعض مناسکِ حج قوت و توانائی کے بغیر پوری طرح ادا نہیں ہو سکتے، بعض مقامات پر حاضری

نہیں ہوسکتی، جیسا کہ خود میرے ساتھ پیش آیا، یوں تو ایسے ضعیف حجاج بھی نظر آئے جن کی کمر خمیدہ تھی، اور دو آدمی ادھر ادھر پکڑے طواف کراتے تھے، لیکن ایسا حج صرف فرض کی ادائیگی ہے، حرم میں پابندی سے حاضری نہیں ہوسکتی، اس لیے میرا مشورہ ہے کہ ضعیف پیری نمودار ہونے سے پہلے حج کر لینا چاہیے۔ ع من نکردم شما حذر بکنید

یہ طریقہ ہندوستان ہی میں ہے کہ حج بخشوانے کے بعد جب زندگی میں کوئی کام باقی نہیں رہ جاتا حج یاد آتا ہے، دوسرے ملکوں کے حجاج زیادہ تر جوان یا زیادہ سے زیادہ ادھیڑ نظر آئے، ضعیف حاجی بہت کم دیکھے، انڈونیشیا کے حاجی قریب قریب سب جوان تھے، خال خال بڈھے دکھائی دیے، مجھے دو چار طالب علموں کے سوا انڈونیشیا والوں کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، بڈھے انڈونیشیائی کبھی نہیں دیکھے تھے، البتہ ان کے مشابہ بدھ بھکشوؤں کی تصویریں دیکھی تھیں، اس لیے ان کو دیکھکر غیر مسلم ہونے کا گمان ہوتا تھا، اور ان کی نماز و تلاوتِ قرآن بے جوڑ سی معلوم ہوتی، مگر ان کی قرأت سنکر رشک آتا تھا،

دوسرا تجربہ یہ ہے کہ جہانتک ممکن ہو کم سے کم سامان ساتھ لیجایا جائے، زیادہ سامان کو لادے لادے پھرنا بڑا بار ہو جاتا ہے، میں خود ناتجربہ کاری کی وجہ سے جاڑے گرمی کا ہر قسم کا سامان ساتھ لے گیا تھا، ان میں ایک معمولی بستر اور چند جوڑے کپڑوں کے سوا سب بیکار ثابت ہوئے، شیروانی اور جوتے تک دو چار مرتبہ کے سوا پہننے کی نوبت نہ آئی، حج کا سب سے آرام دہ لباس کرتہ، صدری اور چپل ہے، راقم کا لباس شروع سے آخر تک یہی رہا، اس میں آدمی بہت ہلکا رہتا ہے، جاڑے کے ایک ہلکے پھلکے سامان رکھ لینے میں مضائقہ نہیں، وہاں ٹھاٹھ کون دیکھتا ہے، نہ خانۂ خدا میں اس کی ضرورت ہے، وہاں تو شکستہ حالی ہی مقبول ہے،

اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جدہ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بازار یورپ، امریکہ اور چین و جاپان

کے بہترین سامانوں سے پٹے پڑے ہوئے ہیں، ان میں بہت سی چیزیں ہندوستان میں دیکھنے کو نہیں ملتیں اور سعودی عرب میں ڈیوٹی نہیں ہے، اس لیے ہر چیز بڑی ارزاں ملتی ہے، چلتے وقت اعزہ و احباب بھی طرح طرح کی فرمایشیں کرتے ہیں، اس لیے حجاج عموماً بڑا سامان ساتھ لاتے ہیں، بلکہ بعض لوگ اسی نیت سے جاتے ہیں اور بمبئی میں اس کو ڈیوٹی سے بچانے کے لیے رشوتیں دیتے، اور طرح طرح کی ناجائز تدبیریں کرتے ہیں، جو ایک حاجی کیا عام مسلمان کے لیے بھی زیبا نہیں ہے، اسلیے جہانتک ممکن ہو اس سے بچنا چاہیے، قانونی حدود کے اندر خریداری میں مضائقہ نہیں،

سفر سے پہلے ناتجربہ کاری کی وجہ سے خوف تھا کہ معلوم نہیں کیا مشکلات پیش آئیں، چنانچہ اس کے لیے ہر ممکن انتظامات کیے تھے، علی میاں سے بہت سے تعارفی خطوط لے لیے تھے، مگر حجاز پہنچکر معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مہمانوں کی آرام و آسایش کا خود انتظام فرماتا ہے، چنانچہ ہر جگہ ایسے ایسے نادیدہ کرم فرما اور معاون و مددگار ملتے گئے جن کا پہلے کوئی تصور بھی نہیں تھا، بلکہ بعضوں سے واقفیت تک نہ تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ مجھے کہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی، ہر جگہ آرام ہی آرام رہا، اور اس کی میزبانی کا حق الیقین ہو گیا،

ایک تاثر اور خاتمہ صاحب استطاعت مسلمان پر پوری عمر میں صرف ایک مرتبہ حج فرض ہے اور ایک حج سے ادا ہو جاتا ہے، مگر میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ پہلا حج صرف قانونی ہوتا ہے، یعنی اس سے فرض تو ادا ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ پورا تجربہ نہیں ہوتا اس لیے کچھ نہ کچھ کمی ضرور رہ جاتی ہے، جو دوسرے حج میں پوری ہوتی ہے، دوسرے جب تک مکہ معظمہ خصوصاً مدینہ طیبہ میں کافی دنوں تک قیام کا موقع نہ ملے، ذوق و شوق پورا نہیں ہوتا اور نہ مدینہ طیبہ کے آثار و مشاہد کی جو دور تک پھیلے ہوئے ہیں، پوری طرح زیارت ہو سکتی ہے، مختصر قیام سے سیری نہیں ہوتی، اسی لیے عموماً ایک حج کے بعد دوسرے حج کی تمنا رہتی ہے، کم سے کم راقم کا تاثر یہی ہے،

مصلحت نیست مرا سیری آزاں آب حیات
ضاعف اللہ بہ کل زمانٍ عطشی

سولھویں اور سترھویں صدی میں

شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

(۲)

مارچ ۱۹۶۶ء کے معارف میں راقم نے ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی مذکورۂ بالا کتاب کے ایک باب پر تبصرہ کیا تھا، اس کی اشاعت کے بعد ہندوستان و پاکستان کے مختلف حصوں سے خطوط آئے کہ اس تنقید کا سلسلہ جاری رہے، اسی اثنا میں جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری الہ آباد نے بھی اس کتاب پر تبصرہ کیا، اس سے اور بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ پروفیسر حبیب نے جس کتاب کو علمی اور تحقیقی دنیا کے آسمان پر رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کی اندرونی حقیقت کیا ہے، یہ کتاب ڈی، لٹ کا محض ایک مقالہ ہوتی تو زیادہ قابل توجہ نہ ہوتی، کیونکہ آجکل پی، ایچ، ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے سلسلہ میں معلوم نہیں کیا کچھ لکھا جارہا ہے، لیکن جیسا کہ پہلے مضمون میں کہا جاچکا ہے کہ پروفیسر محمد حبیب کے پیش لفظ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں، اس بنا پر اس کتاب کی نوعیت بدل گئی ہے، اسی لیے اس مضمون میں کتاب کا مزید تجزیہ کیا جارہا ہے،

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کا اصل مقصد تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلاف ذاتی غصہ، اشتعال اور تکدر کا اظہار کرنا ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے حضرت مجدد الف ثانیؒ

کے متعلق جو ناشائستہ، ناروا اور نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کی تفصیل آگے چل کر آئیگی، اور گو انھوں نے اپنے کو غیر جانبدار اور غیر متعصب اہل قلم ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، اور اسکی سند بھی پروفیسر حبیب اور اپنے دوسرے ممتحنوں سے لے لی ہے، لیکن فرقہ واریت کے خلاف ہونے کے باوجود انکی کتاب کی سطروں کے درمیان ان کا جو فرقہ وارانہ رنگ ظاہر ہوتا ہے، اس کا اندازہ وہ ناظرین کر سکتے ہیں جو اُن کی کتاب کا بہت غور سے مطالعہ کریں گے، بظاہر مصنف نے اپنی تحقیقات کا ایک بڑا طومار باندھ لیا ہے، لیکن اس میں جو غلط اور گمراہ کن تحقیقات پیش کی گئی ہیں، ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے نہ صرف ہر باب بلکہ ہر صفحہ کی ہر سطر کا جائزہ لیا جائے، گذشتہ مضمون میں ایک باب کا تبصرہ ۳۲ صفحے میں ختم ہوا تھا، اس لحاظ سے دس ابواب کا الگ الگ تبصرہ معلوم نہیں کتنے صفحات میں ختم ہو، لیکن خیال ہوا کہ ایسی ناقص کتاب پر اتنا لمبا تبصرہ محض تضییع اوقات ہوگا، اسلیے اب عمومی تبصرہ پر اکتفا کرنے کی کوشش کیجائیگی،

باضابطہ شمار کرنے سے معلوم ہوا کہ مصنف نے اپنی کتاب میں تقریباً ۲،۳۷۴ سطروں کے حواشی لکھے ہیں، یہ سطریں خفی ہیں، جو متن کی جلی سطروں کی دوگنی ہیں، یعنی ۴۸۷۰ سطریں ہوں گی، متن میں جہاں حواشی نہیں ہیں، اس کے ایک صفحہ پر ۴۰ سطریں آئی ہیں، اس طرح ۴۸۷۰ سطروں کے ۲۱۸ صفحے ہوتے ہیں، کل کتاب، کتابیات اور انڈکس وغیرہ چھوڑ کر ۴۲۷ صفحے پر مشتمل ہے، اس طرح حواشی کے ۲۱۸ صفحے نکال دیے جائیں تو اصل کتاب ۲۰۹ صفحے کی رہ جاتی ہے، ان ۲۰۹ صفحوں میں ۶۱ صفحے تمہید کے ہیں، جو کتاب کے اصل موضوع سے بالکل بے تعلق ہیں، اس میں تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی کے صوفیانہ خیالات و رجحانات کا بظاہر ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان خیالات و رجحانات کا تعلق مہدویت، مجددیت اور احیائے دین اسلام سے کیا ہے، وہ پڑھنے والے پر تو ظاہر نہیں ہوتا ہے، البتہ ان کی آنکھوں پر مقالہ نگار اور ان کے فاضل ممتحنوں کی عینکیں چڑھ جائیں تو شاید کوئی تعلق پیدا ہو جائے، اور جب ایسے ہی تعلق پیدا کرنا تھا تو پھر تمام اسلامی ممالک کی

مذہبی تحریکات کا بھی سیر حاصل جائزہ لینا تھا، اس طرح مقالہ کی ضخامت کچھ اور بڑھ جاتی، اب ۲۰۹ صفحے کی تمہید کو محض ڈی لٹ کے مقالہ کی خانہ پری قرار دیجائے تو اصل متن ۲۱۲ کا رہ جاتا ہے، ان ۲۱۲ صفحوں میں دو سو برس یعنی سولہویں اور سترہویں صدی میں احیائے اسلام کی تحریکوں پر فاضلانہ بحث ہونی چاہیے تھی لیکن تحریکوں پر بحث کے بجائے مصنف کے نزدیک جو ان تحریکوں میں پیش پیش رہے ہیں انہی کے تذکرے زیادہ ہیں، اور ان کے ساتھ اور بھی غیر ضروری افراد کا ذکر آگیا ہے، جیسا کہ حسب ذیل تفصیلات سے اندازہ ہوگا۔

تمہید کے بعد جو باب ہے اس میں سید محمد جونپوری سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کے بعد کے تیسرے باب میں سید محمود (۱۰۷) سید محمد خوندمیر (۱۱۰ - ۱۰۷) بندگی میاں شاہ دلاور (۱۱۱) بندگی میاں مالک، بندگی شاہ عبدالماجد نوری (۱۱۲) بندگی ملک معروف (۱۱۲) بندگی میاں یوسف (۱۱۲) بندگی شاہ امین محمد (۱۱۳) بندگی ملک الہداد (۱۱۳) بندگی ملک سجاوندی (۱۱۳) بندگی میاں شیخ عبدالرشید (۱۱۴) میاں مصطفےٰ گجراتی (ص ۱۱۷) قاضی شیخ محمد اوچی (۱۲۰) شیخ صدرالدین (۱۲۰) میاں ابوبکر (۱۲۰) شیخ جھنڈہ پٹنی (۱۲۱) شیخ عبداللہ نیازی (ص ۱۲۲) شیخ علائی (ص ۱۲۴) کے تذکرے ملیں گے، جو سب کے سب مہدوی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، مصنف نے ان کو بھی احیائے دین اسلام کے علمبرداروں میں شمار کیا ہے، حالانکہ جمہور اسلام نے ان سے تبری کا اظہار کیا ہے، چوتھے باب میں شیخ علی متقی (ص ۱۴۲ - ۱۳۶) شیخ محمد بن طاہر (۱۴۳) شیخ عبدالوہاب متقی (ص ۱۴۸-۱۴۴) شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ص ۱۷۵ - ۱۴۸) کے حالات زندگی ہیں، اور یہ سب کے سب مہدویت کے مخالف ہیں، جن کا اعتراف مصنف کو بھی ہے، لیکن ان کو بھی مہدویوں ہی کے ساتھ لا کھڑا کیا گیا ہے، پانچویں باب میں نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں میں خواجہ عبدالخالق (ص ۱۷۶) خواجہ عبداللہ احرار (۱۸۲-۱۸۰) خواجہ خوند محمود (ص ۱۸۵-۱۸۲) خواجہ باقی باللہ (۱۹۳ - ۱۸۵) خواجہ حسام الدین (۱۹۸-۱۹۳) شیخ تاج

(ص ۱۹۸) کے تذکرے ہیں، چھٹے باب میں "حضرت مجدد الف ثانی کی احیائی کوششوں" کے عنوان سے ایک باب ہے، جس میں شیخ بخاری (ص ۲۲۹ - ۲۱۶) لالہ بیگ کابلی (ص ۲۳۰ - ۲۲۸) میران صدر جہاں (ص ۳۳ - ۲۳۰) خان اعظم مرزا کوکہ (ص ۳۶ - ۲۳۳) محمد قلیچ خاں (ص ۳۷-۲۳۶) خواجہ جہاں (ص ۳۹ - ۲۳۷) خانخاناں اور داراب خاں (ص ۴۱ - ۲۳۹) میر محمد نعمان (ص ۲۴۱) حکیم فتح اللہ گیلانی (۲۴۳) کے حالات زندگی کے تاریخی تجزیئے بھی شامل ہیں، مجددیوں کا استقبال (The Reception of Majaddids) کے عنوان سے ساتواں باب ہے جس میں تقریباً دس صفحے (۳۲۲ - ۳۱۳) قاضی نوراللہ شوستری سے متعلق ہیں، اسی باب میں میاں میر (ص ۲۶-۳۲۴) اور گوسائیں جدروپ (۲۹ - ۳۲۶) کا بھی ذکر خیر ہے، آٹھویں باب کا عنوان سترہویں صدی میں وحدت الوجود اور ثقافتی میل جول ہے، اس میں خواجہ عبداللہ خواجہ کلاں (ص ۳۳۱) خواجہ خورد (ص ۳۳۳) شیخ محب اللہ الٰہ آبادی (ص ۳۳۴) میاں میر (ص ۳۴۱) سرمد (ص ۳۵۱ - ۳۴۴) داراشکوہ (ص ۳۶۴ - ۳۵۱) شیخ نعمت اللہ (ص ۳۶۹) شیخ برہان (ص ۳۷۰) سید سعد اللہ (۳۷۲) سے متعلق مفید معلومات ملیں گی، نویں باب کا عنوان مجدد کے جانشین ہیں، جس میں خواجہ محمد صادق (ص ۸۰، ۳۷۶) خواجہ محمد سعید (۸۰-۳۷۸) خواجہ محمد معصوم (ص ۸۸-۳۸۱) شیخ آدم بنوری (ص ۳۸۴) وغیرہ کے تذکرے ہیں، آخری باب میں مصنف کے اپنے تاثرات ہیں،

مذکورۂ بالا بزرگان دین اور افراد کی تفصیلات کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تصنیف اصل موضوع سے ہٹ کر محض تذکرہ و تراجم کی ایک کتاب ہوگئی ہے، جس میں مصنف نے تحقیقاتی کرتب خوب دکھائے ہیں، جو ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تو بہت خوب ہے، لیکن جس مصنف کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے بھی اونچے درجہ کا پایہ دیا گیا ہے، ۔۔۔۔

اس کے لیے تحقیقات کی یہ اچھل کود کسی لحاظ سے بھی زیبا نہیں، اب اس تذکرہ وتراجم کے سلسلہ میں
جو غیر ضروری باتیں آگئی ہیں، ان کو حذف کر دیا جائے تو اصل مقالہ مشکل سے ڈیڑھ سو صفحے کا رہ جاتا
ہے، ان میں بھی آخری باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ گذشتہ ابواب کا محض خلاصہ ہے، اس کو بھی [illegible]
کے مقالہ کے بھرتی کے اوراق سمجھنا چاہیے جس کے بعد اصل موضوع کی ضخامت اور بھی کم ہو جاتی ہے،
کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سے پانچ سات ابواب کے اوراق پھٹ کر علحدہ ہو جائیں
تو ناظرین کو احساس نہ ہونے پائیگا کہ اس میں سے کچھ ابواب غائب ہو گئے ہیں، پھر مزہ یہ ہے کہ کتاب
کے موضوع سے مصنف کی تحقیقات اور تحریروں کو کوئی لگاؤ ہو یا نہ ہو لیکن مصنف اپنی تمام تحقیقات اور
تحریروں میں کوئی نہ کوئی ربط پیدا کر دیتے ہیں، جس طرح غزل کی بے ربطی ہی میں ہم آہنگی ڈھونڈ لیجاتی ہے،
اسی طرح مصنف نے خود اپنی نیرنگی میں یکرنگی پیدا کر لی ہے، اور جس طرح غزل کے جمالیاتی تصورات میں
غزل کے تضاد میں وحدت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس کتاب کے مصنف کی تحقیقات میں انکے
ذاتی خیالات وجذبات کی جو ہمہ رنگی ہے، وہ اس کی بے رنگی کو دور کرتی ہے، موضوع سے ہر [illegible]
کا جوڑ ملانے کا وصف مصنف کو اس خاص وحدت الوجود کے مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکا ہے،
جو اسلامی تصوف کے بجائے ان کے ذہن میں ہے، پوری کتاب کو مصنف کے چھوٹے بڑے مضامین
کا ایک متنوع مجموعہ کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں
کے ناواقف اور بے خبر مستشرقین کے لیے تو قابل مطالعہ ہو سکتا ہے لیکن ہندوستان کے اندر کتاب
کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کو تحقیقات کی دیدہ بندی کے پُرفریب تماشے سے محو حیرت بنانے
کی کوشش کیجارہی ہے،

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
(غالب)

موضوع سے متعلق یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ احیاے دین کے سلسلہ میں مصنف کا معیار
کیا ہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ وہ سید محمد جونپوری کو احیائے دین اسلام کا علمبردار قرار دیتے ہیں اور انکے
مخالفین شیخ علی متقی (ص ۱۲۵) شیخ محمد طاہر پٹنی (ص ۱۴۳) اور شیخ عبد الوہاب متقی (ص ۱۴۴) کو محرک
تجدید دین اسلام قرار دے کر، ان کا ذکر خیر کرتے ہیں، ان کے نزدیک جو علما اور صوفیہ بھی راسخ العقیدہ
اور شریعت کے پابند ہوئے، وہ مجدد دین میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں، اگر یہی معیار ہے، تو پھر سولھویں
اور سترہویں صدی میں بے شمار ایسے علما اور صوفیہ گذرے ہیں، جن کا ذکر ان کی کتاب میں آنا چاہئے تھا،
بلکہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی اکثریت کو بھی مجدد دین میں شمار کر لینا چاہیے تھا، کیونکہ مصنف اس کو تسلیم
نہ کریں، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کی اکثریت راسخ العقیدگی اور شریعت کا احترام کرتی رہی،
مصنف نے جن بزرگوں کو تجدید دین اور احیاے اسلام کے علمبرداروں میں شمار کیا ہے، وہ
در اصل اسلام کے بنیادی تصورات اور اسلامی زندگی کے پاکیزہ نمونے تھے، جن کو اپنے مجدد اور
احیاے دین کے علمبردار ہونے کا احساس بھی نہیں ہوا، مصنف نے ان کو پیش کرنے میں بھی عجیب
غریب طریقہ اختیار کیا ہے، مثلاً شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے حالات جو بیس پچیس صفحات پر مشتمل ہیں
اگر علحدہ مضمون کی صورت میں کسی کانفرنس میں پڑھا جاتا تو مصنف کو ضرور داد ملتی، لیکن اس کتاب کا
جو موضوع ہے، اس لحاظ سے ناظرین کو شیخ عبد الحق کے خاندان اور ان کی زندگی کی جزوی تفصیلات
معلوم کرنے کی بالکل خواہش نہیں ہوتی، وہ صرف ان کے ایسے علمی اور مذہبی کارناموں کو جاننا چاہتے
ہیں جن سے احیاے دین میں مدد ملی، مصنف نے اپنے خیال میں شیخ عبد الحق سے متعلق معلومات کے ڈھیر
لگا دیے ہیں، لیکن جب شیخ عبد الحق کے علمی کارناموں کی تفصیلات لکھنے کا موقع آیا ہے تو مصنف نے
ان کے کارناموں کو برٹش میوزیم کے کیٹلاگ اچھے یا خدا بخش خاں اورنٹیل لائبریری بانکی پور کے کیٹلاگ
یا ڈاکٹر زبید احمد کی *Contribution of India To Arabic Literature* یا

W.M Theodre De Bary کی Sources of Indian Tradition کے ذریعہ سے سمجھ کر اپنے ناظرین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، (ص ۱۷۱)

"مذہبی علوم کا احیا کیا گیا" کے عنوان سے جو باب ہے اس میں ان علماء و فضلاء کا ذکر آنا چاہیے تھا جنھوں نے سولھویں اور سترہویں صدی میں مذہبی علوم کا احیاء کیا، لیکن مصنف نے شیخ علی متقی، شیخ محمد بن طاہر، شیخ عبد الوہاب متقی اور شیخ عبد الحق دہلوی جیسے چار علماء کا ذکر کرکے اس باب کو ختم کر دیا ہے، اور یہ شاید اس لیے کہ ان کے سامنے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی تھی، اس میں ان کو جن علماء کے نام مل گئے، اُن ہی پر کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ لکھنے پر اکتفا کر لیا ہے، مصنف نے خلیق احمد نظامی صاحب کی تحقیقات پر جا بجا چھینٹے ڈال کر اپنے کو بحر التحقیق دکھانے کی ضرور کوشش کی ہے مگر اہل نظر یہ کہنے میں تامل نہ کریں گے کہ مصنف کا چوتھا باب زیادہ تر پروفیسر خلیق احمد کی مذکورۂ بالا کتاب کا ماہرانہ سرقہ ہے، خصوصاً شیخ عبد الحق محدث دہلوی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا بڑا حصہ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی سراسر خوشہ چینی ہے،

مصنف کے مذکورۂ بالا چار علماء کے علاوہ سولھویں اور سترہویں صدی میں بہت سے ایسے علماء گذرے ہیں جن کی تعلیمی، علمی اور فکری سرگرمیوں سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں تابناکی پیدا ہوتی رہی، منتخب التواریخ، آئین اکبری، مآثر رحیمی اور اخبار الاخیار میں ایسے علماء کے نام کا انتخاب کیا جا سکتا تھا، مصنف نے آٹھویں باب میں عالمگیری عہد کے بزرگان دین میں شیخ نعمت اللہ، شیخ برہان، سید سعد اللہ اور شیخ بایزید، شیخ محمد وارث، سید حسن رسول نما، میر نصیر الدین ہروی وغیرہ کو وحدت الوجود کے علمبرداروں میں شمار کرکے ان کا ذکر تو بہت لطف و لذت سے کیا ہے، لیکن عالمگیری عہد ہی میں جن علماء نے فتاوی عالمگیری کی تدوین کی، اُن کو بالکل نظر انداز کر دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، حالانکہ سترہویں صدی میں یہ عالم اسلام کا ایک بڑا شاہکار ہے جس کی تدوین کا فخر ہندوستان ہی کو حاصل ہوا،

اور اس کے فیوض کا سرچشمہ اب تک جاری ہے، اور جب اس کی ترتیب و تدوین ہوئی، تو یہ کتاب زبان حال سے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو از سر نو سنوارنے کے سلسلہ میں کہہ رہی تھی،

کار این است غیر ایں ہمہ ہیچ

مصنف نے بھی اس کو Monumental worke (معرکہ کی تصنیف) کہا ہے، لیکن اس کی اہمیت یہ لکھکر زائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ صرف قاضیوں اور مفتیوں کی رہنمائی کے لیے تھی (ص ۱۱-۴۱۰)۔ ان کو یہی لکھنا بھی چاہیے تھا، کیونکہ اس کی اہمیت کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہ تھی، اور اگر وہ سمجھ جاتے تو خود ان کو معلوم ہوتا کہ انھوں نے اپنے مقالہ کی بنیاد قائم کرکے اس پر جو عمارت کھڑی کی ہے، وہ کس قدر ہوائی ہے،

مصنف کے نزدیک یوگ اور ادویتا ویدانت کا مطالعہ کرنا (ص ۶۳) امرت کنڈ کا فارسی میں ترجمہ کیا جانا (ص ۴۸) حقایق ہندی (ص ۶۱) مرأۃ المخلوقات (ص ۳۵۵) مجمع البحرین (ص ۳۵۴) سر اکبر (ص ۳۵۹) تحفۃ الہند (ص ۳۶۴) پریجاتک (ص ۳۶۵) وغیرہ کا لکھا جانا تو بڑے اہم علمی اور ثقافتی کارنامے ہیں لیکن معلوم نہیں فتاوی عالمگیری کی تدوین کے سلسلے میں انکی تحریکیں گھٹی گھٹی سی ہو گئی ہے،

آٹھویں باب میں سترہویں صدی میں وحدت الوجود اور ثقافتی میل جول کے عنوان سے جو باب لکھا ہے اس میں سرمد کی وسیع المشربی، میاں میر اور ملا شاہ کے صوفیانہ رجحانات، عبد الرحمن چشتی کی مرۃ المخلوقات، دارا شکوہ کی علمی سرگرمیوں، مرزا محمد بن فخر الدین کی تحفۃ الہند کے مباحث کے سلسلہ میں جو کچھ قلمبند کیا گیا ہے اُس میں سینما کی متحرک رنگین تصویروں کی طرح بڑی رنگا رنگی ہے۔ اس باب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ سترہویں صدی میں راسخ العقیدگی، شریعت کی پابندی اور اسلامی تعلیمات کا اگر احترام تھا تو بس یونہی سا تھا، مصنف نے اپنے ناظرین پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ علماء اور صوفیہ کی رسمی نمازوں، عبادتوں اور گنگروؤں کا مذاق اڑایا جاتا (ص ۳۴۴) ملاؤں کی تضحیک ہوتی (ص ۳۴۵) دارا شکوہ کی وسیع المشربی

قابل قدر چیز رہی، مصنف کی ان تحریروں میں کبری اور صغری کا پتہ ملے یا نہ ملے لیکن وہ ناظرین کو اپنے مطلب کے اس منطقی نتیجہ کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اس صدی میں مسلمان شیخ شرف الدین یحیی منیری، شیخ امان پانی پتی، میاں شاہ محب اللہ الہ آبادی اور ملا شاہ سے زیادہ متاثر رہے، مجدد اور ان کے متعصب مقلدوں کی مقبولیت مسلمانوں کے ایک چھوٹے حلقہ تک محدود رہی جو مذہبی مجنونوں اور متعصب ملاؤں پر مشتمل اور خیالی خوف اور خطرات میں مبتلا تھا۔ (ص ۳،۵)

اسی چوتھے باب میں مصنف نے شیخ امان پانی پتی کے ذکر میں ان کو وحدت الوجود کا زبردست حامی بتایا ہے، حواشی (ص ۱۵۱) میں اخبار الاخیار سے ان کے حالات کا ایک لمبا اقتباس دیا ہے جسکو پڑھ کر دھوکا ہوتا ہے کہ اخبار الاخیار کا لفظی ترجمہ ہوگا لیکن مصنف نے اس میں سے بہت سے جملوں اور فقروں کو قصداً حذف کر دیا ہے، مصنف کے اقتباس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:-

The love of Prophet Mohammads family was the chef articale of his faith, If the children of Saiyyids happened to pass by the place where helectured hewould stand up to show reverence.

اخبار الاخیار کی اصلی عبارت ہے:-

"فرمودی سرمایۂ درویشی پیش ما دو چیز است، تہذیب اخلاق و محبت خاندان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، فرمودی کہ علامت کمال محبت آنست کہ از محبوب بمتعلقان او تجاوز کند پس علامت کمال محبت آں باشد کہ محبت او متابعت پیغمبر کند و علامت محبت پیغمبر آنکہ محبت اہل بیت او سرایت کند نقل است کہ اگر در وقت درس از طفلان سادات بازی کناں دراں کوچہ می رسیدند او کتاب در دست گرفتہ و بایستادے تا دم کہ ایشاں ایستادہ بودندے او را مجال نشستن نبودے" (ص ۳۲۶)

اس اقتباس کا ایک بہت ہی اہم جملہ یہ تھا جسکو مصنف نے اپنے ترجمہ میں بالکل حذف کر دیا ہے،

"پس علامت کمال محبت آں باشد کہ بہ محبت او متابعت پیغمبر کند ......"

اخبار الاخیار کے اردو مترجم نے اس جملہ کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کامل محبت کی علامت یہ ہے کہ اسکی محبت میں رسول اکرمؐ کی پیروی کرے (ص ۴۱۴) مصنف نے اس جملہ کے ترجمہ سے کیوں گریز کیا ہے؟ کیا اسلیے کہ اگر وہ اس جملہ کا ترجمہ کر دیتے تو متابعت رسول سے مراد پابندی شریعت ہو جاتی، پھر ان کا یہ دعوی برقرار نہیں رہتا کہ وحدت الوجود کے حامی، شریعت کی پابندی سے بے نیاز ہوتے ہیں، اب جبکہ اخبار الاخیار جیسے مستند تذکرہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شیخ امان پانی پتی متابعت پیغمبر پر زور دیتے تو پھر مصنف کو حضرت امان پانی پتی کو احیائے دین کے علمبرداروں ہی میں لاکھڑا کر دینا چاہیے تھا اور ان پر بھی تعصب، تنگ نظری اور فرقہ واریت کا الزام رکھنا چاہیے تھا،

مصنف کی پوری کتاب کی بنیاد یہ ہے کہ جو علماء اور صوفیہ وحدت الوجود کے حامی رہے، وہ راسخ العقیدگی سے بے نیاز ہو کر رواداری، انتخابیت پسندی (electic s) صلح کل، انسانیت پسندی، ہم وجودیت (co-existence) کے علمبردار اور تمام مذاہب کے بنیادی اتحاد کے قائل تھے، ان کے نزدیک مومن، کافر، جنت و دوزخ، ثواب، عذاب ایک بیہودہ چیز تھی، (ص ۲۷، ۴۲۴-۴۱۰-۳۷۰-۳۴۲-۳۹۶) اور جو علماء اور صوفیہ راسخ العقیدہ اور شریعت پسند تھے، ان میں تعصب، تنگ نظری، فرقہ واریت اور رجعت پسندی تھی (۴۲۱-۴۱۴-۲۳۰-۲۱۴-۱۷۴-۶۶)

مصنف کے بیان کے مطابق اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وحدت الوجود اور راسخ العقیدگی دو متضاد چیزیں ہیں تو پھر اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ حضرت شرف الدین یحیی منیری، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی اور حضرت عبدالقدوس گنگوہی، شیخ امان پانی پتی، حضرت شاہ عبدالرحیم، شاہ محب اللہ الہ آبادی، جو وحدت الوجود کے قائل تھے، نعوذ باللہ، راسخ العقیدہ (orthodox) مسلمان اور پابند شریعت نہ تھے،

اور وہ بھی اکبر اور داراشکوہ کی طرح انتخابیت پسند اور وحدت ادیان کے قائل تھے، اس سے بڑھ کر ان بزرگان دین پر اور کیا بہتان ہو سکتا ہے،

اور پھر مصنف کے بیان کے مطابق نہ صرف حضرت مجدد الف ثانیؒ اور تمام مجددی بلکہ شیخ علی متقی، شیخ محمد بن طاہر، شیخ عبدالوہاب متقی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان ہی جیسے تمام بزرگان دین فرقہ پرست اور رجعت پسند تھے، گویا وہ اپنے وقت کے ڈاکٹر مونجے، گوڈسے اور ساورکر تھے، اسی کو مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زندگی کی مٹی پلید کرنا کہتے ہیں،

تعجب ہے کہ مصنف نے جہاں یہ لکھا ہو کہ "سترہویں صدی میں مسلمان شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ امان پانی پتی، میاں میر، شاہ محب اللہ الہ آبادی اور ملا شاہ سے متاثر رہے"، وہاں اس فہرست میں داراشکوہ اور حضرت سرمد کے نام چھوڑ دیے ہیں، پہلے کہا جا چکا ہے کہ مصنف نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کا اگر واقعی گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو حضرت مجدد الف ثانی سے جو الجھن ہے وہی حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی تعلیمات سے پیدا ہو جاتی اور ان کو شاہ میر اور ملا شاہ کی صف میں لا نہ کھڑا کرتے، اسی طرح گذشتہ سطور میں حضرت امان پانی پتی کی محبت رسول اور متابعت رسول کا ذکر آچکا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عبدالحق محدث دہلوی جیسے بلند رجعت اور متعصب عالم کی علمی اور روحانی سرگرمیاں بڑی حد تک حضرت امان پانی پتی کی تعلیمات کی رہین منت ہیں تو کیا مصنف اس کو تسلیم کریں گے؟ مصنف اخبار الاخیار کا گہرا مطالعہ کریں، تو ان کو اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑیگا، لیکن وہ تو تمام ماخذوں سے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے صرف اپنے مطلب کی باتیں حاصل کرنے میں ماہر ہیں،

اسی طرح شیخ محب اللہ الہ آبادی کے علوم باطن کی طرف تو مصنف کی نظر گئی، لیکن ان کا علوم ظاہر میں جو درجہ تھا، اس کا مطالعہ انھوں نے مطلق نہیں کیا، اگر مصنف کا یہ خیال ہے کہ شیخ محب اللہ الہ آبادی وحدۃ الوجود کے حامی ہونے کی وجہ سے راسخ العقیدگی اور پابندی شریعت سے بے نیاز ہو کر کفر و ایمان اور جنت و دوزخ کی تفریق کے قائل نہ تھے، تو یہ سراسر ایک عالم دین ہی نہیں، بلکہ علوم ظاہر و باطن کے "ایک سر خیل اقران

پر بہتان ہے،

اور اگر ہم مصنف کے بیان کی روشنی میں یہ تسلیم کر لیں کہ سترہویں صدی میں مسلمان میاں میر اور ملا شاہ سے متاثر (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۵)

ہے تو پھر یہ یقین کرنا پڑے گا کہ حضرت عبدالحق محدث دہلوی حضرت خواجہ باقی باللہ اور ان کے تمام نقشبندی خلفاء کے علمی، دینی اور روحانی کمالات رائگاں ہو کر رہ گئے، گو مصنف نے ہم کو یہ بھی بتایا ہے کہ سترہویں صدی میں شیخ محمد پٹنی، شیخ عبدالوہاب متقی اور ان کے شاگردوں اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مذہبی علوم خصوصاً حدیث (ص ۱۳۵) شریعت، سنت اور اسلام کی خرافاتی شان و شوکت کی بحالی کے لیے ایک صدی تک انتھک کوشش کی، لیکن ان کے خیال میں یہ انتھک کوشش شورش بے مدعا ہو کر رہ گئی، اور وہ شاید خوش ہیں کہ اسلام کی شان و شوکت جس کو انھوں نے خرافاتی قرار دیا ہے، بحال نہ ہو سکی، اور وہ بار بار اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اورنگزیب جیسے حکمراں کی لمبی حکومت کے زمانے میں بھی وحدت الوجود کے حامیوں اور رواداری اور انتخابیت پسند صوفیوں کے اثرات جاری رہے (ص ۳۶۲-۳۷۰) مصنف کے اس دعوی کے بعد مآثر عالمگیری کا یہ بیان بھی صریحاً غلط ثابت ہو جاتا ہے

> حضرت (یعنی عالمگیر) کی توجہ باطن اور فیض مواطن سے دین حنیف اور ملت حنیف کو ہندوستان کے سواد اعظم میں قوت ملی اور اسکا رواج اس طرح ہوا کہ پہلے کے فرمانرواؤں میں ایسی صورت حال نہ تھی (ص ۵۲۸)

اور ہمارے مصنف کے دعویٰ کے ساتھ ان تمام ہند و مورخین کا بیان بھی سراپا غلط ہو جاتا ہے جو یہ لکھتے لکھتے نہیں تھکتے کہ اورنگزیب کا عہد رجعت پسندی اور تنگ نظری کا عہد تھا،

مصنف نے جس مشقت سے آٹھواں باب لکھا ہے، اگر اسی محنت، ریاضت اور مشقت سے کام لیکر سترہویں صدی کی زندگی، مستی، شراب نوشی، عیاشی، بوالہوسی، جوئے بازی، رشوت ستانی اور دوسرے مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی جرائم کی تحقیقات کرتے تو ان کو شاید اتنا مواد مل جاتا کہ ان کو اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی مشکل نہ ہوتی کہ ہندوستان میں اس صدی میں نہ تو اسلام، نہ تصوف، نہ ہندو مت اور نہ عام اخلاق کا کوئی اثر تھا، بلکہ پورا ملک گمراہی،

ضلالت اور فسق و فجور میں مبتلا رہا، اور ایک جگہ تو وہ عالمگیری عہد کا ذکر کرتے ہوئے لکھ ہی گئے ہیں کہ بد عنوانی، بداخلاقی اور معصیتیں صرف قاضیوں ہی میں نہ تھیں، بلکہ مسجد کے اماموں میں بھی تھیں، جو بلا پس و پیش بھنگ خانے جایا کرتے تھے (ص ۱۲۴) اس کے لیے مصنف نے شاہ ولی اللہ کی تصنیف انفاس العارفین (ص ۹۱) کا حوالہ دیا ہے، انفاس العارفین کی اصل عبارت یہ ہے :-

حضرت ایشان (یعنی شاہ ولی اللہ کے چچا ابو الرضا محمد) در اوائل روزے بعد مراقبۂ صبح برخاستند و در بنگ خانہ رفتہ خاموش نشستند و خواستند کہ کیفیت ظہور عصمت حق را تماشا کنند، ہر گاہ بنگ فروش قدحے سوے ایشان می آورد کسے از اہل مجلس دستش می گرفت کہ ایں شخص را مدہ چند نوبت ہمیں صورت واقع شد بعد ازاں وقت نماز در آمد خاطر ایشان مضطرب شد اما ضبط کردہ نشستہ ماندند امام مسجدے کہ در حوالی آں موضع بود چوں وے نیز بشرب بنگ ارتکاب داشت برخاست و دست ایشان را محکم گرفت و ہر چند ابا کردند نگذاشت و کشاں کشاں بمسجد برد، و آب وضو حاضر کرد، و ایشان را امام ساخت ازاں باز خاطر ایشان مطمئن شد کہ ایں عفت و تقویٰ امریست معلوم کہ خواہی یا نخواہی ایشان را براں می دارند بغیر اختیار ایشان" (ص ۹۱)

یہ روایت جس مقصد سے لکھی گئی ہے وہ تو مصنف کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن وہ بلا تکلف لکھ گئے :

Imams of masques too ... visited hemp saloons without hesitation

اصل عبارت میں تو "امام مسجدے" مرقوم ہے، مصنف نے اس ایک مثال سے Imams of the mosque لکھ کر اس زمانہ کے تمام اماموں کو مورد الزام قرار دیا ہے، حالانکہ وہ خود اپنی کتاب میں اتفاقی یا اکا دکا واقعہ (Stray incident) سے عمومی بات کہنے یا لکھنے کو سطحی مشاہدہ سمجھتے ہیں (ص ۳۰۳)

انفاس العارفین کی مدد سے حضرت شاہ ولی اللہ کے چچا حضرت شیخ ابو الرضا، کو جس طرح پیش کیا گیا ہے

وہ مصنف کی مزید فریب کاریوں کی ایک بڑی مثال ہے، وہ لکھتے ہیں :

Abu Reza Mohammad a saint of strong pan-theistic beliefs appears to have possessed consi-derable influence over his contemporaries

"ابو الرضا محمد وحدت الوجود کے سخت عقائد والے بزرگ تھے، وہ اپنے معاصرین پر بڑے اثرات رکھتے تھے۔"

اس کے لیے بھی انفاس العارفین ہی کا حوالہ دیا گیا ہو لیکن خود شاہ ولی اللہ نے ان کے حالات کی ابتدا ان الفاظ میں کی ہے :-

"عم بزرگوار عالی مقدار پیشوائے اہل ذوق و وجود و امام ارباب معرفت و شہود ....."

شاہ ولی اللہ ان کو جہاں وحدت الوجود کا پیشوا کہتے ہیں، وہاں ان کو امام ارباب معرفت و شہود و لکھتے ہیں لیکن مصنف کے خیال میں وجود و شہود دو متضاد چیزیں ہیں، وہ وجود کے علمبرداروں کو اچھا اور شہود کے حامیوں کو برا بتاتے ہیں، وہ چاہے کچھ سمجھیں، شیخ ابو الرضا کو وحدت الوجود کا حامی بنا کر دارا شکوہ وغیرہ کی صف میں لا کھڑا کرنا محض ان کی اپج ہے، اور مصنف کے نزدیک تو وحدت الوجود کے ماننے والے شرک اور کفر کی تفریق سے بالاتر ہوتے ہیں، اور وہ شریعت کی پابندی سے بے نیاز ہوتے ہیں لیکن شیخ ابو الرضا تمام جزوی باتوں میں اتباع سنت کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ اسی انفاس العارفین میں ہے کہ جب وہ مسجد جاتے تو مسجد کے نزدیک پہنچ کر کھڑے ہو جاتے، پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالتے پھر دایاں پاؤں بڑھا کر مسجد میں داخل ہوتے (ص ۹۳) اسی انفاس العارفین میں یہ بھی ہے کہ شیخ ابو الرضا نے فرمایا کہ

کذب اقوال آنست کہ قول مخالف شریعت گوید و کذب در افعال آنست کہ فعل مخالف شریعت کند و کذب در احوال آنست کہ متلون شود از حالی بحالی زیرا کہ صدق حال ہماں شہود است (ص ۱۱۶)

اسی انفاس العارفین میں شرک (۱۰۲) اور کفر صریح (۱۱۶) پر بھی شیخ ابو الرضا کے ملفوظات ملیں گے۔

مصنف نے اپنے مطلب کی خاطر کفر، شرک، اور کفار جیسے الفاظ کو جو شیخ ابو الرضا کے حالات زندگی کے سلسلہ میں استعمال کیے گئے ہیں، بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

At the time of the uprising of satnamis which have taken an ugly turn Shaikh Abur Riza allegedly predicted the victory of the emperial forces.

حالانکہ اس سلسلہ میں انفاس العارفین میں شیخ ابو الرضا کی زبانی یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں،

فرمودند فتح مسلمین واقع شد وکفار بکلی منہزم و مستاصل گشتند (ص ۹۰)

مصنف نے مسلمین کا ترجمہ تو (imperial forces) کر دیا ہے اور لفظ کفار کے ترجمہ سے گریز کر گئے ہیں، مصنف شیخ ابو الرضا کے بارے میں لکھتے ہیں:

ان کی نگاہوں میں آدمیوں کی دنیاوی حیثیت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، وہ امیر و غریب سے یکساں سلوک کرتے کیونکہ انھوں نے اورنگزیب تک کو بھی اپنے سے ملنے کی اجازت نہیں دی، حالانکہ اس نے اسکے لیے التجائیں کیں (ص ۲۰۳)

مصنف کے انگریزی کے الفاظ یہ ہیں:

The difference in the wordly status of men had no mea-
-ning in his eyes, he treated the rich and poor alike.
For he did not allow even Aurangzeb to see him
despite the latter's entreaties

اس انگریزی کی عبارت میں لفظ "For" جس طرح استعمال کیا گیا ہے اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ مصنف کا صغریٰ، کبریٰ کچھ ہوتا ہے اور نتیجہ کچھ اور ہوتا ہے، ان کی عبارت پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شیخ ابو الرضا غریب و امیر سے یکساں سلوک کرتے تو پھر انھوں نے اورنگزیب سے ملنے سے کیوں انکار کیا؟

مصنف نے انفاس العارفین کی اصل عبارت کو بالکل مسخ کر کے پیش کیا ہے، ناظرین اصل عبارت ملاحظہ کریں:

جماعتے از یاران ذکر کردند کہ بادشاہ عالمگیر چند بار درخواست کرد کہ حضرت ایشان را زیارت کند قبول نکردند پیوستہ امراء و متمولان در نظر ایشان محقر بودند ہیچ التفات بایشان و بہ ایاء ایشان نمی کردند الا بمبالغہ اتمام و اگر غربا مخلصین چوں کفش دوزان و طحانان وغیر ایشان چہار فلوس یا پنج فلوس ہدیہ می آوردند بدست مبارک خود می گرفتند۔ (ص ۹۰)

مذکورہ بالا عبارت سے تو یہ ظاہر ہے کہ شیخ ابو الرضا امیروں اور دولتمندوں سے ملنا پسند نہیں کرتے اور ان کو اپنی نظروں میں حقیر جانتے تھے، اسی لیے اورنگزیب سے بھی ملنا پسند نہیں کیا، اس کے مقابلہ میں مخلص غربا، چار پانچ پیسے کے بھی ہدیے لاتے تو دست مبارک میں لیکر قبول کر لیتے، اوپر کی فارسی عبارت سے مصنف کے اس بیان کی تصدیق مطلق نہیں ہوتی کہ وہ امیر و غریب سے یکساں سلوک کرتے،

مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ ابو الرضا نے شیخ احمد سرہندی کے پوتے شیخ عبدالاحد کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں وحدت الوجود کی فوقیت دکھا کر ان کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے (ص ۲۰۳) مصنف نے پورے وثوق کے ساتھ اپنے ناظرین کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مجدد کے پوتے انتشار اور اخلاقی بدحالی کے بلیگ میں مبتلا رہے (ص ۲۶۴) اس بیان کے مطابق شیخ احمد سرہندی کے پوتے شیخ عبدالاحد بھی اخلاقی بدحالی کے بلیگ میں مبتلا رہے ہوں گے، پھر شیخ ابو الرضا جیسے بزرگ نے ان سے خط و کتابت کرنی کیوں پسند کی؟ انفاس العارفین میں شیخ عبدالاحد کے مکتوبات کو جس احترام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ مجددیوں کے اثرات شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں بھی تھے، حالانکہ مصنف کا دعویٰ ہے کہ اورنگزیب کے عہد کے آتے آتے مجددیوں کے اثرات زائل ہو چکے تھے، اور یہی نہیں جس عزت و وقار کے ساتھ شیخ عبدالاحد کا ذکر انفاس العارفین میں کیا گیا ہے، وہ شاید مصنف کی نظروں سے نہیں گذرا، شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ جب شیخ ابو الرضا کا آخری وقت آیا تو شیخ عبدالاحد ان کی زیارت کو آئے، حضرت

ابوالرضاء اپنی عادت کے خلاف چٹائی کے سرے پر بیٹھے ہوئے تھے، اور دوسرے لوگ پائیں میں تھے، جب شیخ ابوالرضاء نے شیخ عبدالاحد کو دیکھا تو تبسم فرمایا اور بڑی بشاشت کے ساتھ ان سے ملے، اور ان کو اپنی چٹائی پر بٹھایا، کچھ دیر صحبت رہی، لیکن کوئی بات نہ ہوئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے دل تمام علائق سے چھٹکارا پا چکے ہیں، اور رمیدگی کے فرط سے بات کرنا پسند نہ کرتے تھے، وہ یعنی شیخ عبدالاحد اٹھے حضرت ابوالرضاء کی اہلیہ سے شیخ کی قرابت تھی، اسی لیے وہ گھر کے اندر لیجائے گئے، اور وہاں بھی بغیر کچھ کہے سنے بیٹھے رہے، موذن نے مغرب کی اذان کہی تو حضرت ابوالرضاء کے بڑے صاحبزادے شیخ فخر العالم نے ان سے کہا کہ باہر (بیرون) جانا چاہیے، یہ سن کر حضرت ابوالرضاء نے فرمایا کہ بابا ابتک بیرون و اندرون کا فرق رکھا ہے، اسی وقت باہر آئے اور نماز ادا کی، اس صحبت کے ختم ہونے کے بعد شیخ عبدالاحد نے فرمایا کہ ان کی موت ان کے نزدیک آگئی ہے، اور رفیق اعلیٰ کی طلب ان پر غالب ہے، اور اس کے کچھ روز کے بعد حضرت ابوالرضاء رحلت فرماگئے، (۱۵۷)

حضرت ابوالرضاء وجود اور شہود دونوں کے قائل تھے، شاہ ولی اللہ نے جہاں یہ لکھا ہے:

بوحدت وجود قائل بودند و دراں باب تحقیقے عظیم داشتند (ص ۹۰)

وہاں وحدت شہود کے متعلق ان کے خیالات بھی لکھے ہیں، مثلاً

"می فرمودند مشاہدہ بعبور عالم مثال دارد و احتیاج نداردو وہم چنیں شہودی کہ بمحض جذبۂ الٰہیہ حاصل شود اما بر بقائے ایں نوع شہود و اعتماد نیست بخلاف شہودی کہ بعد سلوک حاصل شود کہ آں بعد صعودی باشد و بربقا او اعتماد ست" (ص ۱۰۸)

اہل شہود کی فضیلت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"اہل شہود از حیہ و عقرب و شیر و وزد ان نمی ترسند لہذا بعضے اکابر نفوس خود را امتحان کردند و در بر کہ آنجا سباع بسیار بود و طعام و آب یافتہ نشود اندا ختند چوں بخاطر ایشاں ہیچ خطرہ نیامد دانستند کہ کامل شدہ اند" (ص ۱۱۷)

شاہ ولی اللہ کے خاندان کے بزرگوں نے وجود و شہود کے اختلافات کو مٹانے کی کوشش کی، شیخ ابوالرضاء کے ملفوظات ان ہی باتوں کی شہادت دیتے ہیں، مثلاً

"می فرمودند حق نام حضرت وجود ست کہ مشہود فی الخارج است و باقی بصرافت خود چنانکہ آب باوجود اختلاف اشکال ادعیہ والوان آنہا باقی ست بصرافت و عالم اسم اطوار وجود و شیونا نست و اشکال و صور فانیہ اوست کہ از صورتے بصورتے مبدل می شود۔"

اس کے بعد جو عبارت ہے وہ مصنف اگر سمجھ جائیں تو پھر ان کا سارا ہوائی قلعہ ختم ہو جائے،

چوں کفر و فسق و قاذورات وغیرہا اگرچہ فی حد ذاتہا کمالات ست آں را بحضرت وجود تعلق نیست بلکہ اوصاف عالم اند اگرچہ قیوم کل حضرت حق است زیرا کہ اگر قیوم کفر و معاصی او نباشد از کجا موجود شوند، ہمچنیں تولد و تولید از اوصاف عالم است یعنی ایں تعینات و صور مبدلہ از اوصاف حضرت وجود نسبت نیست کہ تعینات و اوصاف او امور اعتباریہ است زیرا کہ ہمہ نسب و اعتبارات ذات اند، ذات باوجود ظہور او درینہا ہمہ منزہ است۔" (۱۱۶)

ان ملفوظات کے بعد جو ملفوظات ہیں، ان سے خیالات کی وضاحت اور بھی ہو جاتی ہے، کہتے ہیں کہ جاہل لوگ صوفیہ کے کلام کو سمجھ نہیں پاتے اور ان کے کلام کے معنی کچھ اور بتاتے رہتے ہیں،

می فرمودند متصوفہ جاہلاں معنی کلام صوفیہ علیہ ندانند و گویند ظہور حق در مظاہر مثل ظہور شمس در کائنات بازشۂ دریا مختلفہ است و شکست نیست کہ ایں قول بجزئی محدود و مباین از مظاہر می کشد حاشا قدعن ذالک . بعضے سلف برائے تفہیم محجوباں امثال ایں امثال اختیار کردہ اند ظلیت عالم بنسبت خدائے تعالیٰ بمعنی ظہور شئی ست در مرتبہ ثانیہ نہ آنکہ مباین باشد در رنگ ظل شجر کہ بر جدا ادفتہ تعالی اللہ عن ذالک (۱۱۷)

ان تمام خیالات کے بعد مصنف کا یہ کہنا بالکل گمراہ کن ہے کہ شیخ ابوالرضاء نے اپنے خطوط میں شیخ

عبدالاحد کو وحدت الوجود کی فوقیت کا قائل کرنے کی کوشش کی ہے (۴۳،۴۴) شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ دونوں نے مکتوبات ایک دوسرے کو ضرور لکھے لیکن جب دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے تو پھر کوئی اختلاف نہیں رہا،

چوں ملاقات مکرر واقع شد و ہر یکے از ایشاں مقام دیگرے را معلوم کرد معاملہ دیگر ظہور نمود (ص ۱۴۳)

ان ہی بزرگوں سے متاثر ہو کر شاہ ولی اللہ نے "فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود" میں یہ بتایا ہے کہ شیخ محی الدین ابن اکبر کا وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانی کا وحدت الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں، وجود و شہود کا جھگڑا محض نزاع لفظی ہے، ان میں مطابقت ہے، مخالفت نہیں،

مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ ابو الرضا اور عبدالاحد نے اپنے مکتوبات میں بھکتی کے ہندی دوہوں کا وافر استعمال کیا ہے، وافر (profuse) کا لفظ فارسی اشعار کے لیے آسکتا تھا، کیونکہ ان مکتوبات میں پچاس ساٹھ اشعار فارسی کے لکھے گئے ہیں، تو ان کے ساتھ مشکل سے آٹھ نو دوہرے ہوں گے، اسی انفاس العارفین میں حضرت ابو الرضا کی تصنیف سے فرائض، نوافل، تلاوت، درود، استغفار، نماز باجماعت، نماز چاشت وغیرہ کی جو تعلیم (۱۵۴-۱۵۶) پیش کی گئی ہے، اس کو مصنف واقعی پڑھتے تو حضرت ابو الرضا کو احیائے دین اسلام کے رجعت پسندوں ہی میں شمار کرکے ان کو بھی برا بھلا کہنے پر آمادہ ہو جاتے،

آٹھویں باب میں مصنف نے شیخ بایزید، شیخ محمد وارث، سید حسن رسول نما اور میر نصیر الدین ہروی کا ذکر وحدت الوجود کے مبلغین کی حیثیت سے کیا ہے (ص ۳۴۷،۳۴۸) اور حوالے منتخب اللباب جلد دوم (ص ۵۵۰، ۵۵۲) کے دیے ہیں، منتخب اللباب جلد دوم میرے پیش نظر بھی ہے، اس کی کسی سطر یا کسی عبارت میں یہ وضاحت نہیں کہ یہ بزرگان دین وحدت الوجود کے حامی تھے،

اسی باب میں شیخ برہان کا بھی ذکر ہے، ان کو بھی مصنف وحدت الوجود کا مبلغ بتاتے ہیں، گو منتخب اللباب میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، مصنف نے شاید منتخب اللباب کے اس بیان سے یہ رائے قائم کر لی کہ

از قوم بلہ مل ارادت تمام در خدمت ایشاں داشت

یا پھر اس بیان پر کہ ان کے مرید فنا فی الشیخ ہو کر سکر کی بیخودی میں ان کو خدا کہہ دیتے، منتخب اللباب کی اصل عبارت یہ ہے:

جمعے از مریدان خاص شیخ کہ شب و روز در خانقاہ حاضر می بودند از کمال عقیدت فنا فی الشیخ گشتہ در عالم بیخودی سکر شیخ را بخدا منسوب و مخاطب ساختند۔ (ص ۵۵۵)

مصنف نے اس عبارت سے فائدہ اٹھا کر یہ حاشیہ آرائی کی ہے:-

Some of Shaikh's disciples were so immensely devoted to him and the atmosphere around him were so reverberating with pantheism that they in their ecstatic state would not hesitate in calling him God.

مصنف نے فنا فی الشیخ کا ترجمہ کرنے کے بجائے atmosphere reverberating with pantheism لکھ کر ناظرین میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن مصنف کو اس کا بھی اقرار ہے کہ شیخ برہان اس کو پسند نہ کرتے کہ ان کے مریدین ان کو خدا کہا کریں اور اگر وہ اس سے توبہ نہ کرتے تو شرع کے مطابق ان کو قتل کر دیا جاتا، اگر شیخ برہان کے مریدین وحدت الوجود ہی کے نشہ میں ان کو خدا کہتے رہتے تو وحدت الوجود کے ایسے ہی حامیوں پر شریعت پسند بزرگان دین نے لعنت بھیجی ہے، جس کو ہمارے مصنف فرقہ پرست اور رجعت پسند کہتے ہیں، تو پھر بھی الزام شیخ برہان پر بھی آتا ہے، کیونکہ منتخب اللباب میں ہے کہ شیخ برہان ایسے مریدوں کو فاسد سمجھتے، ان کو توبہ کرنے کو کہتے، ان پر شرعی احکام جاری کرتے، اور وہ توبہ کرکے باز نہ آتے، تو گویا شریعت کے بموجب ان کو قتل کرا دیتے، شرعی حکم کی اس پابندی کی بنا پر مصنف کو، شیخ برہان کو بھی احیائے دین کے حامیوں میں شمار کرنا چاہیے تھا،

شیخ برہان ہی کے سلسلہ میں ہے کہ جب اورنگزیب نے داراشکوہ کے شرعی احکام کی عدم احتیاط کی شکایت کی اور اپنی طرف سے دین نبوی کے احکام کی ادائیگی اور رعیت پروری کا یقین دلاکر، فاتحہ اور توجہ باطنی کی درخواست کی تو شیخ نے فرمایا

از فاتحہ ما فقیراں کم اعتبار می شود شما کہ بادشاہید بہ نیت خیر و عدالت و رعیت پروری فاتحہ بخوانید ہم دست بفاتحہ بر می داریم، شیخ نظام ایں گفت کہ پادشاہی مبارک باد...... (منتخب اللباب ص ۵۵۵)

اس پر مصنف نے کیا خوب حاشیہ آرائی کی ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی گفتگو کا آغاز فرقہ وارانہ تعصب کے ساتھ کیا لیکن شیخ برہان کے جواب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی خاص نظر انسانیت نوازی پر تھی، اور اس پر وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ سیاسی معاملات کو مذہبی خیالات سے بالکل الگ رکھا جائے (ص ۱۰۱) کجا می نماید کہ جب امی زندگی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو گی، مصنف یہ بھی فرماتے ہیں کہ شیخ برہان نے کوئی پیشین گوئی نہیں کی، یہ نکتہ محض فارسی نہ جاننے والوں کے لیے تو ٹھیک ہے، ورنہ شیخ برہان کا یہ کہنا کہ "شما بادشاہید" آخر کیا ہے؟ مصنف رقم طراز ہیں کہ شیخ برہان نے پیشین گوئی نہیں کی، بلکہ شیخ نظام نے بادشاہت کی مبارک باد دی، اسی قسم کی دلیلوں سے انھوں نے اپنے تمام مقالات کی تزئین و آرائش کی ہے۔

منتخب اللباب میں جہاں شیخ برہان وغیرہ کا ذکر ہے، وہاں میر تقی واعظ ملتانی کا بھی ذکر ہے، مصنف نے موخر الذکر کے حالات لکھنے میں بھی تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر کے Historical facts Twisted پیش کرنے کا ثبوت دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اورنگزیب کے زمانہ میں مسکرات میں بھانگ عوام اور مذہبی طبقہ (Theologians) میں بہت عام تھی، اور اس کے استعمال کی عادت نے ہر طرف جڑ پکڑ لی تھی، میر مرتضیٰ نے اس کے استعمال کرنے والوں کی سخت مذمت کی، ان کے مواعظ سے عوام تو کچھ حد تک ضرور متاثر ہوئے ہوں گے لیکن علماء مشائخ، امراء اور حکام میں بڑی مخالفت ہوئی اور وہ جہاں گئے ان کی زندگی اذیت بن گئی، انھوں نے تمباکو کے استعمال کی مذمت کی تو پونہ میں بلوہ ہو گیا، جس کی روک تھام

بڑی مشکل سے ہوئی، ایک بار جب کہ وہ بھانگ کے استعمال کی مذمت کر رہے تھے، اور اپنے مقصد کی حمایت میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیث پیش کر رہے تھے تو کشمیر کے ایک قابل آدمی نے کہا پیغمبر کے زمانہ میں تو بھانگ اپنی عدم موجودگی کی وجہ سے نمایاں تھی، یہ آپ کے پانچ سو برس کے بعد ہوئی، تو تم جھوٹی حدیث پیش کر رہے ہو، تم خود مذمت کے مستحق ہو، اسی کے بعد میر مرتضیٰ کی خالص (puritanism) اسلامی تعلیمات کی مخالفت اتنی بڑھی کہ ان کے لیے مسجد سے اپنے گھر آنا مشکل ہو گیا اور ان کو اتنی اذیت ہوئی کہ اپنی رستگاری خودکشی کر کے کی (ص ۱۳-۴۱۲)

مصنف نے ان تمام باتوں کے لیے منتخب اللباب کا حوالہ دیا ہے، لیکن منتخب اللباب میں کہیں یہ نہیں ہے کہ بھنگ عوام اور مذہبی طبقہ میں بہت مقبول تھی، اور اس کے استعمال کی عادت نے جڑ پکڑ لی تھی، یہ سراسر کذب و افترا ہے، مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء، فضلاء اور حکام میر مرتضیٰ کے اس لیے مخالف ہو گئے کہ انھوں نے بھانگ کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا، یہ بھی صحیح نہیں، میر مرتضیٰ کی سخت کلامی کی وجہ سے علماء، فضلاء، اور حکام ان کے مخالف ہو گئے، منتخب اللباب میں ہے:

کلمات درشت بزبان می آورد لہذا ابر شہرے کہ می رفت و وعظ می گفت، حکام و فضلا و مشائخ با او عداوت بہم رسانده در خفت او می کوشیدند۔ (ص ۵۶۳)

مصنف لکھتے ہیں کہ میر مرتضیٰ نے تمباکو کے استعمال کی مذمت کی تو پونہ میں بلوہ ہو گیا، معلوم نہیں مصنف نے پونہ کس کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے، منتخب اللباب میں تو اورنگ آباد لکھا ہوا ہے،

چنانچہ روز جمعہ در مسجد جامع خجستہ بنیاد اورنگ آباد قاضی اکرم کہ آخر قاضی القضات حضور گردید، ہمہ ارباب عدالت راجمع ساختہ اعلام طلب میر مرتضیٰ در میان آورد، و نزدیک بود کہ فساد عظیم برپا شود۔" (ص ۵۶۳)

مصنف کا یہ لکھنا بھی صحیح نہیں کہ میر مرتضیٰ کی خالص اسلامی تعلیمات کی مخالفت اتنی بڑھی کہ ان کے لیے مسجد سے اپنے گھر آنا مشکل ہوگیا اور ان کو اتنی اذیت پہنچی کہ اپنی رستگاری خودکشی کرکے کی، منتخب اللباب کی اصل عبارت یہ ہے:

"کار بجائے رسانند کہ از سختی جوانان عشرت دوست و فضلائے دنیا پرست میر مرتضیٰ از مسجد بخانہ خود رفتہ بر نیامد، و ہماں ایام اجل موعود او رسید و بقول مشہور خود را مسموم ساخت"۔

دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ مصنف کو اپنی تحریر میں "سختی جوانان عشرت دوست اور فضلائے دنیا پرست" کا بھی ترجمہ کرنا چاہیے تھا، اور پھر منتخب اللباب کے اس جملہ کو بھی نظرانداز کردیا کہ "در ہماں ایام اجل موعود او رسید" اور لکھ گئے کہ اپنی رستگاری خودکشی کرکے کی، ان کے خلاف جو روایت ہوتی ہے، اس کو وہ نظرانداز کرنے میں تو بڑے ماہر ہیں، لیکن جو روایت ان کے مطلب کی ہوتی ہے اس سے فوراً فائدہ اٹھالیتے ہیں۔

(باقی)

غنی کشمیری

از جناب علی جواد صاحب زیدی

(۴)

شاگرد غنی کے شاگردوں کے بارے میں بھی زیادہ معلومات نہیں ملتیں، ان کے دو شاگردوں کا پتہ چلتا ہے، ایک تو وہی مسلم ہے، جس نے دیوانِ غنی مرتب کیا ہے، اس کا ذکر مجھے کسی تذکرہ میں نہیں ملا، مقدمہ کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ اسے علوم متداولہ میں دستگاہ تھی، اور وہ شاعر بھی تھا، اس نے ایک قطعۂ تاریخ ایسا بھی لکھا ہے جس کا پہلا مصرعہ فارسی اور دوسرا عربی میں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں زبانوں میں دخل رکھتا تھا، افسوس ہے کہ مسلم کا حال کسی تذکرہ میں نہیں ملتا،

دوسرے شاگرد کا ذکر بھی مسلم ہی نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے، یہ ملک شہید ہے، اس کو مسلم نے "ملک الشعراء، خادم الفضلاء" اور "سرحلقۂ شاگردانِ رشید" بتایا ہے[1]، برٹش میوزیم کے نسخے اور مطبوعہ نسخوں میں اصل عبارت یہ ہے:

"خواتم باتفاق خادم الفضلاء[2]، ملک الشعراء، سرحلقۂ شاگردانِ رشید ملک شہید بتدوین دیوان سحر بیانش حقِ شاگردی بتقدیم رسانم"۔

یہ ملک شہید غالباً وہی ہیں جن کے بارے میں "تاریخ حسن" میں یہ عبارت درج ہے:

"لالہ ملک شہید از مردم کشمیر بود، در شعرگوئی و تاریخ یابی سحرکاری میکرد و بنام حضرت محبوب سبحانی یکہزار و یکصد تاریخ تصنیف کردہ و از ہر یک بیت تاریخ ولادت و وفات انتخاب یافتہ می شود

[1] دیوان غنی، طبع نہم، مطبوعہ نولکشور، دیباچہ [2] نسخۂ خطی دیوان غنی (برٹش میوزیم) مخطوطہ نمبر ۳۰۰ ۵.R میں "خادم الفقراء" درج ہے۔

و از نوادر روزگار است[۱]

لیکن "رایل ایشیاٹک سوسائٹی" بنگال کے نسخہ (ب ۵) میں ملک شہید کا ذکر نہیں ہے، اور دیباچہ میں صرف اتنی عبارت درج ہے :-

"خواستم کہ بتدوین دیوان سحر بیانش حق شاگردی بتقدیم رسانم۔"

اب یا تو موخر الذکر نسخہ کا کاتب وہ پوری عبارت لکھنا بھول گیا اور پھر دوسرے نسخوں میں ملک شہید کے کسی ہی خواہ نے حذف شدہ ٹکڑا بڑھا دیا، زیادہ نسخوں میں ملک شہید کا نام موجود ہے، اسلیے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں اور اسے کم از کم اس بات کا ثبوت سمجھتے ہیں کہ ملک شہید غنی کے شاگرد تھے، "سر حلقۂ شاگردان رشید" کے الفاظ سے یہ صاف عیاں ہے کہ غنی کے اور بھی بہت سے شاگرد رہے ہوں گے، لیکن ہمیں ان کا حال معلوم نہیں،

تدوین دیوان غنی کے حالات کے بارے میں مختلف تذکرہ نویسوں کے بیانات میں جو عام تضاد ہے وہی تدوین دیوان غنی کے سلسلے میں بھی پایا جاتا ہے، "تکملۃ الشعراء" اور "تذکرہ حسینی" کی عبارتوں سے یہ قرینہ نکلتا ہے کہ غنی نے اپنی زندگی ہی میں اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا، قدرت اللہ شوق نے صائب کے سر یہ الزام لگایا ہے کہ صائب نے دوران قیام کشمیر میں ایک بار غنی نے اپنا دیوان صائب کو دکھایا، صائب نے صرف چند اشعار منتخب کر لیے، باقی دیوان کو غرق آب کر دیا، اس عبارت کا خاتم شوق نے اس اظہار افسوس پر کیا ہے کہ" باید فہمید کہ مرزا صائب چہ ظلم و بے انصافی کردہ، خون ہمہ مضامین بگردن صائب است[۲]"۔ اس کے برعکس حسین دوست سنبھلی کے بیان سے یہ گوشہ نکلتا ہے کہ غنی نے اپنا کلام خود ہی پانی میں ڈبو دیا تھا :

"باز دیوان خود را کہ از لک بیت برگزیدہ دہزار بیت بیاض نگاہداشتہ و باقی را بآب دادہ پیش مرزا (ای مرزا صائب) گذاشت[۳]"

۱؎ تاریخ حسن جلد ۴ ص ۲؎ تکملۃ الشعراء، ص ۲۲۴ ۳؎ تذکرہ حسینی

گویا صائب کی نظر سے گزرنے کے پہلے ہی ایک لاکھ سے زائد اشعار پر مشتمل کلیات موجوں کے سپرد کیا جا چکا تھا، اور یہ فیصلہ خود غنی کا تھا، صائب کا اشارہ تک شامل نہ تھا۔

ان دونوں بیانوں میں سے کوئی بھی میرے لیے قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ اس امر کی ہم عصر شہادت موجود ہے کہ غنی نے اپنی زندگی میں اپنا دیوان مرتب ہی نہیں کیا، یہ شہادت نہ صرف یہ کہ ہمعصر ہے بلکہ غنی کے خاص شاگرد مسلم کی ہے، مسلم نے صاف صاف لکھا ہے کہ

(۱) طبع بدیہ یابش ہرگز بفکر شعر فرو دنیاوردہ و تدوین دیوان را تحصیل حاصل شمردہ ..."

(۲) سخنے چند کہ از ذات شریفش یادگار ماندہ بود حرز بر صفحۂ روزگار ثبت نمی نمود و خلقی چند کہ طبع لطیفش بجائے خود نشاندہ چوں یتیمان بی خانماں در سفینہ ہای مردم کوچہ بکوچہ میگردید، بیش از آنکہ مسودۂ اشعارش شیرازہ جمعیت پذیرد و سخنان بیاضش صورت دیوان گیرد، رشتۂ حیات از ہم گسیخت[۱]"

اس پوری عبارت، بالخصوص آخری جملے سے یہ بات شک و شبہہ سے بالاتر ہو جاتی ہے کہ غنی نے مرتے دم تک اپنا دیوان مرتب ہی نہیں کیا تھا، صائب یا غنی ڈبوتے کس کو؟ ہاں، کچھ اشعار مسودہ کی صورت میں اور کچھ ایک بیاض پر غنی نے درج کر رکھے تھے، بہت سے اشعار غنی کی شہرت کی بنا پر ان کے ہمعصروں نے انتخاب کر کے اپنی بیاضوں میں ٹانک لیے تھے، کچھ دوستوں اور جاننے والوں کے حافظہ میں محفوظ تھے، مگر باقاعدہ دیوان کی صورت میں جمع نہ ہونے پائے تھے، غنی کی وفات کے بعد ان کے شاگرد مسلم نے یہ ارادہ کیا کہ غنی کا ایک ایک شعر جہاں سے اور جس طرح سے مہیا ہو سکے جمع کر لیا جائے، اور اس سلسلے میں انھیں غنی ہی کے ایک دوسرے شاگرد لالہ ملک شہید کی اعانت بھی حاصل تھی، چنانچہ دیوان غنی کے اکثر نسخوں میں یہ عبارت پائی جاتی ہے کہ :

"خواستم باتفاق خادم الفضلاء، ملک الشعراء، سر حلقۂ شاگردان رشید، ملک شہید بتدوین دیوان سحر بیانش حق شاگردی بتقدیم رسانم۔"

۱؎ دیباچہ دیوان غنی از مسلم

لیکن بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخہ ب ؟ میں جو بارہویں صدی ہجری کے اوائل کی تحریر ہے
باتفاق خادم الفضلا، ملک الشعرا، سرحلقۂ شاگردان رشید، ملک رشید کا پورا ٹکڑا ہی غائب ہے، جہاں یہ امکان ہے
کہ اس نسخہ کے کاتب نے ملک رشید کی دشمنی میں یا سہواً یہ عبارت حذف کردی ہو، وہاں یہ بھی امکان ہے کہ
دوسرے نسخوں میں ملک شہید کی اعانت سے تعلق رکھنے والی عبارت الحاقی ہو اور ملک شہید کے
کسی حمایتی نے بڑھادی ہو،

بہرحال مسلم کا تنہا یا ملک شہید کی مدد سے دیوان غنی مرتب کرنا، تصویر کا ایک ہی رخ ہے، محمد افضل
سرخوش نے تدوین دیوان غنی کا شرف اپنے استاد محمد علی ماہر، متبنائے میر جعفر معمائی کو بخشا ہے[1]
محمد حسین آزاد نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ محمد علی ماہر نے عام فہم اور اچھے اچھے اشعار چھانٹ کر
دیوان غنی مرتب کیا[2]، چونکہ مسلم نے یہ بات بڑی صراحت سے لکھی ہے کہ مسلم کے دیوان کی تدوین
اسی سال ہوئی جس سال کہ "مرغ روح آں سبک سیر شاہراہ معنی (ای غنی) با طائر سخن باپشان طائر اعلیٰ
شتافتہ و در فضائے عالم ملکوت پرواز طائران قدس یافتہ" اس لیے سال تدوین ۱۰۷۹ھ قرار پاتا ہے،
البتہ یہ طے نہیں ہو پاتا کہ ماہر اور مسلم میں کس کے دیوان کی تدوین پہلے ختم ہوئی، اور یہ دو دواوین باہم ایک دوسرے
سے کن حیثیتوں سے ممتاز یا مختلف ہیں، کیونکہ ابھی تک ماہر کا مرتب کردہ دیوان یا دیباچہ میری نظر سے
نہیں گزرا ہے۔ اگر کلمات الشعراء میں ذکر نہ ہوتا تو آج ماہر کے مرتب کردہ دیوان کا علم بھی ہمیں نہ ہو پاتا،

ایک عجیب و غریب بات یہ بھی ہے کہ آئی و ناف نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے فارسی
مخطوطات کی فہرست میں لکھا ہے کہ نسخہ ب ؟ میں ماہر کا دیباچہ موجود ہے۔ ایسا ہی دعویٰ چارلس ریو
نے مخطوطہ نمبر 30 or کے بارے میں "برٹش میوزیم کیٹلاگ" حصہ دوم میں بھی کیا ہے، ان دونوں ہی
نسخوں میں وہی دیباچہ ہے جو مسلم کا تحریر کردہ ہے۔ غالباً ان دونوں کو سرخوش کے بیان سے یہ دھوکا

---

[1] کلمات الشعراء از سرخوش [2] گلستان فارس [3] دیباچہ دیوان غنی از مسلم

ہوا ہے کہ جو دیوان بھی ملتا ہے ماہر ہی کا ترتیب دیا ہوگا اور دیباچہ بھی اسی نے لکھا ہوگا، یہ دونوں ہی قیاسات
غلط ہیں، اور حیرت ہے کہ کسی ثبوت کے بغیر ان مستند فہرستوں میں کیونکر راہ پا گئے،

مختلف نسخے | دیوان غنی کے جو نسخے ابتک دستیاب ہو سکے ہیں ان میں آگرہ والا نسخہ سب سے قدیم ہے، یہ نسخہ
۱۰۸۰ھ میں تحریر ہوا ہے، اور ظاہر ہے کہ یا تو یہ اصل ہے اور یا اصل کے فوراً ہی بعد نقل ہوا ہے، یہ نسخہ اب جموں و کشمیر
اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز نے خرید لیا ہے، اس نسخہ کے ابتدائی چند صفحے موجود نہیں ہیں، اسلیے
یہ بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ مسلم کا مرتبہ نسخہ ہے یا ماہر کا، لیکن چونکہ مسلم نے غنی کے مرنے کے بعد ہی
کشمیر ہی میں مرتب کیا تھا، اس لیے قرینہ یہی ہے کہ یہ نسخہ بھی کشمیر ہی میں لکھا گیا ہوگا، اس طرح تین صدیوں کے
بعد اس نسخہ کا گھوم پھر کر کشمیر پہنچ جانا "حق بحقدار رسید" کے مرادف ہے، اس دیوان پر کچھ مہریں بھی ثبت
ہیں جو مٹادی گئی ہیں، ان مہروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی امیر یا شاہزادے نے اپنے کتب خانے
کے لیے حاصل کیا تھا، یہ نسخہ کافی مکمل اور ضخیم ہے، اور اس میں اور مسلم کے مرتب کردہ نسخوں میں بہت کم
فرق ہے، اسلیے یہ نتیجہ نکال لینا بھی بیجا نہ ہوگا کہ یہ نسخہ مسلم ہی کے اصل نسخہ کی نقل ہے،

اس نسخہ کے بعد اور بے شمار نسخے لکھے گئے، اور ملک اور بیرون ملک کے مختلف کتب خانوں
میں بکھرے پڑے ہیں، فی الحال ان نسخوں کا مجمل سا ذکر یہاں کیا جاتا ہے جو ہماری نظر سے گزر چکے ہیں،

مخطوطات دیوان غنی | (۱) ؟۔ مملوکہ جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، کاتب
ملک ابوالبقا، تاریخ تحریر ربیع الثانی ۱۱۲۶ھ مطابق ۱۷۱۴ء، غنی کو ملک الشعراء بابا محمد طاہر
عرف آشائی تخلص غنی" لکھا ہے،

(۲) ۱۲۔ نسخۂ آگرہ، خریدکردہ جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، نام کاتب
نامعلوم، تاریخ تحریر ۱۰۸۰ھ مطابق ۔۔۔ قدرے ناقص الاول، خوش خط و صحیح، تا ہنوز
قدیم ترین نسخہ۔

(۳) ب ۔ مملوکہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ (کیٹیلاگ نمبر ۴)، کاتب محمد نعیم، تاریخ تحریر
۱۵ ربیع الآخر ۱۱۴۰ھ خواہ ۱۱۸۴ھ، سالِ تحریر نا صاف لکھا ہوا ہے، اس پر نصیر الدولہ نصرت جنگ بہادر
حافظ محمد ناصر خاں بہادر اور فورٹ ولیم کالج وغیرہ کی مہریں ہیں، آئی وانا نے سوسائٹی کے فارسی کے مخطوطات
کی فہرست میں لکھا ہے کہ اس نسخہ میں آبہر کا دیباچہ ہے، یہ غلط ہے، یہ وہی مسلم کا لکھا ہوا دیباچہ ہے جو تمام معروف نسخوں میں ملتا ہے،

(۴) ب ۲ ۔ مملوکہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ (کیٹیلاگ نمبر ۵)، نام کاتب ندارد، تاریخ تحریر
۲۲ جمادی الاول ۱۱۴۱ھ، کسی قدر ناقص ہے،

(۵) ب ب ۔ مملوکہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ (کیٹیلاگ نمبر ۶)، کاتب و تاریخ تحریر ندارد،
قراین سے بارہویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے، ناقص الآخر ہے،

(۶) پ ۔ مملوکہ خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ (نمبر فہرست جلد سوم ۳۳۴/۵۹۴) خوشخط نستعلیق
حواشی مطلا صفحۂ اول پُر از نقش و نگار، تاریخ تحریر رمضان المبارک سنہ ۱۱۶۰ھ، کاتب محمد فیض اللہ،
خواجہ محمد جان جیو کی فرمائش پر لکھا گیا،

(۷) پ ح ۔ مملوکہ خدا بخش لائبریری پٹنہ (نمبر فہرست جلد سوم ۳۳۵/۵۹۶) خوشخط، نستعلیق،
تاریخ تحریر ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۳ھ، کاتب عبد الحلیم، ابتدائی ۹ غزلیات محشی، کاغذ مختلف الالوان،

(۸) پ م ۔ نسخہ مملوکہ خدا بخش پبلک لائبریری پٹنہ (نمبر فہرست شاملات جلد اول ۱۹۱۰/۱۹۰۴)
ناقص الاول، تاریخ تحریر و نام کاتب نامعلوم، مطبع مصطفائی کے مطبوعہ نسخے کی نقل معلوم ہوتا ہے،

(۹) پ د ۔ دیباچہ دیوان غنی، مملوکہ خدا بخش لائبریری پٹنہ (نمبر فہرست شاملات جلد دوم ۲۴۴/[illegible])
یہ پ م کا جزو اول معلوم ہوتا ہے، جو ایک ہی کاتب کا لکھا ہوا ہے، اور کاغذ بھی وہی ہے، یہ دیباچہ وہی
مسلم کا تحریر کردہ ہے، غالباً جلد سازی کے وقت پ م سے جدا ہوگیا، اور غلطی سے علحدہ جلد
میں شامل ہوگیا،

(۱۰) پ س ۔ "دیوان غنی کشمیری" ۔ مملوکہ خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ (نمبر فہرست ۴۰/۲۴۱۹)
نام کاتب و تاریخ کتابت ندارد، صفحہ اول پر نواب مجد الدولہ کا نام لکھا ہے، غالباً ان ہی کے لیے حاصل کیا گیا ہوگا،
نسخے کی خریداری کے بارے میں بھی مختصر سی عبارت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد اللہ کی معرفت
۸ شوال ۱۱۵۴ھ کو خریدا گیا تھا، ظاہر ہے کہ تحریر اس سے پہلے ہی کی ہوگی،

(۱۱) پ ف ۔ مملوکہ خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ (نمبر فہرست ۴۳/۲۴۲۴) تاریخ تحریر ۲۸ محرم الحرام
۱۰۸۸ھ، کاتب محمد شفیع اصفہانی، سنہ کتابت کچھ صاف نہیں ہے، لیکن ۱۰۸۸ھ ہی ہونے کا قرینہ ہے،
اگر یہ صحیح ہے تو ا ا کے بعد سب سے پرانا نسخہ یہی ہے،

(۱۲) پ گ ۔ مملوکہ خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ (نمبر فہرست ۶۶/۳۳۰) کاتب گور پرشاد، تاریخ
تحریر ۸ جمادی الثانی سنہ ندارد، غالباً تیرہویں صدی ہجری کے اوائل کی تحریر ہے،

(۱۳) پ ق ۔ مملوکہ خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ (نمبر فہرست ۴۸/۲۶۸) ناقص الاول و الآخر، نام کاتب و تاریخ تحریر نامعلوم،

(۱۴) پ ع ۔ مملوکہ قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا، پٹنہ، نام کاتب و سنہ کتابت نامعلوم، اغلاط سے پُر ہے،
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب کم علم تھا، ایک مثنوی شتابیہ صرف اسی نسخے میں ملی ہے، اندازہ ہے یہ نسخہ کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے کا معلوم ہوتا ہے،

(۱۵) ل ۔ مملوکہ برٹش میوزیم لندن (فہرست ریو جلد دوم نمبر OR ۳۰۰) اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف اول
کی تحریر ہے، یہ نسخہ ابتدا شاہان اودھ کے کتب خانے کی زینت تھا اور انکی مہروں سے مزین ہے، اسمیں مسلم کا دیباچہ موجود ہے
لیکن مرتب فہرست ریو نے غلطی سے اسے ماہر سے منسوب کر دیا ہے،

(۱۶) س ۔ مملوکہ رضا لائبریری، رامپور (نمبر ۲۶ ۳۵ ف) کاتب محمد ماہ، تاریخ کتابت ندارد، اس پر کسی
سید محمد شاہ کی مہر ہے، یہ انتخاب دیوان ہے،

(۱۷) س م ۔ مملوکہ رضا لائبریری، رامپور (نمبر ۲۴۵ ۳ ف) کاتب کا نام کہیں نہیں لکھا ہوا ہے، تاریخ
اختتام کتابت ۸ شعبان سنہ ۱۲۱۱ھ ہے،

(۱۸) ر/ب ۔ مملوکہ رضا لائبریری رامپور (۳۵۲۵ ف) "ر" اور "ر/۲" کے مقابلے میں "ر/ب" میں کچھ اضافے بھی ہیں، تاریخ تحریر ندارد۔

(۱۹) ج ۔ مملوکہ ریسرچ اینڈ پبلی کیشنس ڈیپارٹمنٹ، حکومت جموں و کشمیر

(۲۰) ج/ب ۔ نسخہ دیوان غنی مملوکہ جامع مسجد بمبئی،

(۲۱) بحا/ب ۔ مملوکہ بمبئی یونیورسٹی (کیٹلاگ ص ۱۱۰ نمبر ۳۸) تاریخ تحریر درج نہیں ہے،

(۲۲) بحا/ب ۱ ۔ ایضاً کیٹلاگ ص ۱۶۹ نمبر ۹۱)

(۲۳) ع ۱ ۔ مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ذخیرہ سر شاہ محمد سلیمان (۲/۴) مکتوبہ بعہد محمد شاہ بادشاہ

(۲۴) ع/ب ۔ مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ذخیرہ حبیب گنج (۱۱۸/۳۴) کاتب سید ذو الفقار علی، مورخہ ۲۲ شعبان ۱۲۱۸ھ، قدرے ناقص الاول، شروع میں ایک طویل مثنوی ہے لیکن نام شاعر درج نہیں ہے،

ان نسخہ جات کے علاوہ چند اور نسخوں کا بھی دوسرے کتب خانوں کی فہرستوں میں سراغ ملا ہے، حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:۔

(۱) بوڈلین لائبریری میں تین نسخے موجود ہیں، جن کا ذکر کیٹلاگ میں نمبر ۱۱۲۷ و ۱۱۲۸ و ۱۱۲۹ میں ملتا ہے،

(۲) آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں بھی "دیوان غنی" موجود ہے، اور کیٹلاگ کی چوتھی جلد میں ص ۲۹۰ پر شمارہ ۱۲۲۷۵ کے تحت درج ہے،

(۳) تاشقند لائبریری میں بھی ایک نسخہ ملا ہے، اور اسکی ایک نقل (مائکرو فلم) اکیڈمی نے حاصل بھی کر لی ہے، اس میں غزلیات، فردیات اور چند رباعیاں تو ہیں لیکن مثنوی اور قطعات نہیں ہیں،

مخطوطات کے علاوہ "دیوان غنی" کے کئی مطبوعہ نسخے پائے جاتے ہیں، طباعت دیوان کے معاملے میں غنی کشمیری بیحد خوش قسمت ہیں، ہندوستان کے فارسی شعراء میں ان کا دیوان سب سے زیادہ اور متعدد بار کئی چھاپہ خانوں سے شائع ہوا ہے، یہ بتانا مشکل ہے کہ سب سے پہلے دیوان غنی کی طباعت کب ہوئی، لیکن جو قدیم ترین نسخہ میرے مطالعہ میں آیا ہے، وہ مطبع مصطفائی لکھنؤ کا ہے، یہ نسخہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں طبع ہوا، اس نسخہ کے آخر میں مالک مطبع نے یہ عبارت درج کی ہے:

این احقر عباد اللہ الغفور، محمد مصطفیٰ خاں ولد حاجی محمد روشن مبرور و مغفور آں نسخہ ناسخہ دواوین معاصرین را از شرح عمدۂ شارحین متین خلیفہ عبد الرزاق یمینی حبل اللہ من اصحاب الیمین و دیگر نسخ صحیحہ قدیمہ و کتب اصطلاحات لغات و تحشی میر ناصر علی متخلص بنصیر بپایہ تصحیح رسانیدہ و اشعار مثنوی شعار و دیگر نقائص نیف لطیفش را بر طبق نسخہ مرقومہ ۱۱۰۲ھ یکہزار و یکصد و دو بخط ولایت نہایت پسندیدہ ارباب این فن منقول و مرتب کنانیدہ در مطبع مصطفائی واقع محلہ محمود نگر زیر اکبری دروازہ من محلات بیت السلطنت لکھنؤ بتاریخ بست و ہفتم رمضان المبارک ۱۲۶۱ھ بپیرایۂ طبع پوشانید۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصطفائی والوں کے سامنے ۱۱۰۲ھ کا کوئی نسخہ تھا، جو ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے، اس نسخہ سے اسکی تصحیح ہوئی اور تصحیح میں خلیفہ عبد الرزاق یمینی کی شرح اور میر ناصر علی کے حواشی سے مدد لی گئی، کچھ اور قدیم نسخے بھی پیش نظر تھے، اور مشکوک مقامات کی تصحیح کتب اصطلاحات و لغات کے حوالے سے ہوئی، ابھی تک صرف مطبوعہ نسخوں میں حواشی ملے ہیں، قلمی نسخوں میں صرف نسخہ پ ح مملوکہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ابتدائی نو غزلیں محشی ہیں، اور حواشی وہی ہیں جو مصطفائی پریس کے مطبوعہ ایڈیشن میں پائے جاتے ہیں، گمان ہے کہ کسی نے دیوان کے ساتھ حواشی کی نقل بھی شروع کی ہوگی لیکن بعد میں گھبرا کر ارادہ ترک کر دیا ہوگا، نسخہ مصطفائی کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے دیوان غنی کے شارح اور حاشیہ نگار کا پتہ چلتا ہے، اس نسخے کی کاپیاں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں،

---

[1] تتمہ دیوان غنی مطبوعہ مصطفائی پریس، لکھنؤ (۱۲۶۱ھ)

اس کے بعد کم از کم دس ایڈیشن "دیوان غنی" کے اور بھی چھاپے گئے ہیں، ان میں بھی نو تو صرف نولکشور والوں نے پہلے کانپور اور بعد میں لکھنؤ سے چھاپے ہیں، نولکشور کا پہلا ایڈیشن غالباً ۱۲۸۵ھ (۶۹-۱۸۶۸ء) میں کانپور سے طبع ہوا، نویں ایڈیشن کی ابتدا میں ناشر نے ایک مختصر سا نوٹ بھی شامل کیا ہے، جس سے بعد کے اضافوں پر روشنی پڑتی ہے۔

"چونکہ دیوان غنی بہت عرصہ سے اسی قدیم طریقہ سے چھپتا چلا آرہا تھا اور اس میں اغلاط چند در چند پائے جاتے تھے، لہٰذا اس مرتبہ مطبع ہذا نے خاص توجہ سے کام لیا اور بہت سے قدیم و مطبوعہ نسخوں سے اس کی تصحیح کرائی گئی، اور جو اشعار کہ مروجہ دواوین میں موجود نہیں ہیں اور قدیمی نسخوں میں موجود ہیں، ان کا بھی اضافہ کرکے شائع کیا ہے۔"[1]

دیوان کے بعض ایڈیشنوں میں ایسے اشعار بھی اضافہ کیے گئے ہیں جو اگرچہ مسلم نے جمع کرلیے تھے لیکن اس نے غالباً ازراہِ مصلحت ان اشعار کو دیوان میں شامل نہیں کیا تھا، یہ اشعار جدید تر نسخوں میں اس توضیحی نوٹ کے ساتھ درج کرلئے گئے ہیں:۔

"اشعار متفرقہ از قسم تواریخ و تعریفات و ہجویات وغیرہ کہ مسلم مغفور شاگرد مصنف مبرور بعد جمعیت اشعار در آخر دیوان از تصنیف لطیفش درج ساختہ، در ینجا ہماں ترتیب جامع بے تقدیم و تاخیر برای تفریح صغیر و کبیر بپایہ تحریر می رسد، تا کدام شعر از اشعار مشہورۂ مصنف باقی نماند۔"[2]

مسلم نے ان اشعار کو غالباً اس لیے خارج کردیا ہوگا کہ وہ ہجو نگاری وغیرہ کو غنی کے شایانِ شان نہیں سمجھتا تھا، لیکن ان ہجویات کو دیکھ کر غنی کی زندگی کا یہ پہلو اجاگر ہوجاتا ہے کہ وہ زاہد خشک نہیں تھے، بلکہ ترکِ ریاضت کے باوجود مزاح اور زندہ دلی سے دلچسپی رکھتے تھے۔

مطبع نولکشور و مصطفائی کے علاوہ مطبع صفی کانپور نے بھی آخر ربیع الاول ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) میں دیوان غنی کا ایک ایڈیشن چھاپا تھا، اب تازہ ترین ایڈیشن جموں کشمیر اکیڈمی فنون و ثقافت ادب نے شائع کیا ہے۔

---

[1] دیوان غنی طبع نہم نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۱ء، کور کا دوسرا صفحہ [2] ایضاً ص ۱۳۳

غنی کی بدیہہ گوئی مشہور ہے، اس بدیہہ گوئی اور شاعری کی طویل مدت کو دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت خیز ہے کہ ان کا اتنا مختصر دیوان ہمیں دستیاب ہوسکا ہے، اس کو غنی کی بے پروائی پر محمول کرکے ٹالا نہیں جاسکتا، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ غنی سے عقیدت کی بنا پر مرتبین نے ایسے اشعار کا انتخاب ہی نہیں کیا جو غنی کے محبوب طرزِ سخن سے تال میل نہیں رکھتے تھے، اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ کشمیر کی بعض قدیم بیاضوں میں کچھ ایسے اشعار بھی ملے ہیں جو صناعی اور تمثیل سے مبرا ہیں، ظاہر ہے کہ غنی ایسی شاعری پر قادر تھے، لیکن انتخاب کرنے والوں نے ان اشعار کو مذاقِ زمانہ کے مطابق نہ پاکر نظر انداز کردیا۔

ایک جدید نسخہ

دیوان کے تازہ نسخہ کی ترتیب میں جب مختلف نسخوں سے رجوع کیا گیا تو متفرق اشعار کے علاوہ کئی رباعیاں، ایک پوری مثنوی، نثر کا ایک وقیع ٹکڑا اور ایک پوری غزل ایسی ملی جو کسی ایک مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں تھی، یہ تمام بکھرا ہوا مواد پہلی بار دیوان غنی کے اس تازہ ترین ایڈیشن میں شامل ہوا ہے جو جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز شائع کرنے جارہی ہے،

غنی کی نثر کا ٹکڑا بہتوں کے لیے نیا ہوگا، کیونکہ مروجہ دیوانوں میں نہیں ملتا، مطبوعہ نسخوں میں یہ ٹکڑا صرف مصطفائی پریس کے نسخے میں شامل اور وہ بھی صفحہ ۹۴ کی بغل میں الگ سے شامل کیا گیا ہے، غالباً دیوان کی اشاعت کے بعد حاصل ہوا اور شامل کرلیا گیا، قلمی نسخوں میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخہ ب اور ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے نسخہ ح میں بھی نثر کا یہ ٹکڑا موجود ہے، یہ نثر کا ٹکڑا وہی ہے جس میں غنی پر سرقہ شعر کا غلط الزام عائد کرنے کی روایت خود مصنف نے بیان کی ہے، روایت اسی کتاب میں پہلے درج ہوچکی ہے، اور دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے،

قاضی عبدالودود صاحب کے مملوکہ نسخہ پ ع میں جاڑے سے متعلق ایک پوری مثنوی درج ملی جو کسی اور مطبوعہ یا قلمی نسخے میں پوری کی پوری موجود نہیں ہے، اس مثنوی کا ایک شعر

در یں موسم از بسکہ یخ بستہ آب
شد آئینہ خانہ سرای حباب

مطبوعہ نسخوں میں بھی موجود تھا، اس کے علاوہ تقریباً پندرہ شعر نسخۂ آگرہ میں بھی درج ملے، ایک شعر نسخۂ آگرہ (۲) میں ایسا بھی تھا جو نسخۂ پ ع میں درج نہیں ہے اور وہ شعر یہ ہے ؎

بناشد چو دیوانہ کس پیش ہیں
کہ اخگر صفت گشت گلخن نشیں

اسی طرح رضا لائبریری رامپور کے قلمی نسخہ ر ب میں بعض نئے اشعار بھی ملتے ہیں، مثلاً امیر الامرا اسلام خاں کے قطعۂ تاریخ میں تین شعر ایسے ملے ہیں جو غنی کے کسی اور دیوان میں شامل نہیں ہیں، اسکے علاوہ بہت سے ایسے اشعار جو اکثر نسخوں میں قطعات کی صورت میں شامل ہوئے ہیں، وہ اس نسخہ میں غزلوں کا جز ہیں، آخری صورت حال دوسرے نسخوں میں بھی نظر آتی ہے، جو اشعار ایک جگہ قصیدہ یا قطعہ کی شکل میں لکھے گئے ہیں وہی آگے چلکر یا تو کسی غزل کا حصہ بنگئے یا پورا قصیدہ اور قطعہ متعدد غزلوں کے سانچے میں ڈھال دیا گیا،

غنی نے اپنے ایک عزیز خاص خورشید پر کئی دردناک رباعیاں لکھی ہیں، نسخہ میں حسب ذیل رباعی بھی اسی موضوع پر دریافت ہوئی اور اس سے بعض گتھیاں سلجھانے میں بڑی مدد ملی، ابھی تک یہ رباعی صرف اسی نسخے میں دکھائی دی ہے ؎

از مردن خورشید جگر ہا خوں شد
درد دل ماخستہ دلاں افزوں شد
آساں نبود فراق اسباب کمال
خم خاک نشیں در غم افلاطوں شد

اسی ضمن کی ایک رباعی نسخہ ب میں درج ملی،

از مردن تو حاصل عمرم تباہ شد
چیزے کہ صرف گریہ نشد خرج آہ شد
می آمدم کہ تنگ در آغوش گیرمت
سنگ مزار تو ام سنگ راہ شد

غرض، نئے مواد کی تلاش بے سود نہیں رہی اور کافی نیا سامان ہاتھ لگا، نسخوں میں باہم اختلافات و تضادات بھی تھے، انھیں جدید ترین دیوان کے حواشی میں درج کر دیا گیا ہے اور یہ یقیناً ایک اہم اضافہ ہے، تحقیق و جستجو کے طفیل جہاں ایک طرف یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ بے شمار اشعار درج ہونے سے رہ گئے تھے،

وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض نسخوں میں بہت سے الحاقی اشعار شامل کر لیے گئے تھے، ایسے اشعار خدا بخش لائبریری پٹنہ کے نسخہ پ س میں بہت ہیں، رباعیوں میں متعدد رباعیاں خواہ مخواہ غنی سے منسوب کر دی گئی ہیں، ان ہی میں وہ رباعی بھی ہے جو ملکہ ممتاز محل سے متعلق ہے ؎

از حق چو ندا شنیدہ ممتاز محل
زود از ہمگی پریدہ ممتاز محل
با خویش ہمیشہ تا در جنگ زدیم
فردوس محل گزیدہ ممتاز محل

یہ رباعی کلیم کی ہے، اسی طرح دوسری رباعیوں میں سے بھی اکثر کلیم کی نکلیں، یہی حال کئی غزلوں کا ہے، بالخصوص یہ غزلیں جن کے مطلعے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، صریحاً الحاقی ہیں ؎

مگو جاناں کہ نتواں از رخ جاناں نظر بستن
بسے مشکل بود بر روی صاحبخانہ در بستن

شب عید است و میباید در میخانہ وا کردن
بمی خشکی زہد رشتہ داراں را دوا کردن

ای صبا ایں دل صد چاک بجاناں برساں
شانہ تحفہ بآں زلف پریشاں برساں

اگر مردی بتعلیق خار سعی در پا کن
قدم از سر کن و سودائی منزل را سر وا کن

کس نمیگیرد دگر در ایں صہبا پیرہن
از تو چاک لے دست بیتابی وا زما پیرہن

ہیچ کاری بر نمی آید ز دست تنگ من
ورنہ جنگی نیست داماں ترا با چنگ من

یہ پوری کی پوری غزلیں دیوان کلیم میں موجود ہیں، اور اسلوب کے اعتبار سے بھی طرز غنی سے مختلف ہیں، اس قسم کی حرکتیں بعض مرتبین اور کاتبین تفریحاً کر دیا کرتے تھے یہاں اسکی تشریح اسلیے ضروری ہوئی کہ آئندہ تحقیقات کرنے والے اس خار زار میں نہ الجھیں، کاتبوں اور مرتبوں نے ان غزلوں میں سے اکثر جگہ کلیم تخلص کو غنی سے بدل دیا ہے لیکن یہ مسلمہ طور پر غنی ہی کا کلام ہیں،

اسی طرح بمبئی یونیورسٹی کے کیٹلاگ میں نمبر ۱۲۱، پر ایک بیاض ہے جس میں مختلف مثنویاں درج ہیں، اسی میں ایک جنگنامہ بھی شامل ہے، کیٹلاگ میں یہ "جنگ نامہ" غنی سے منسوب کر دیا گیا ہے، اس انتساب کی بنا پر غالباً اس جنگ نامہ کا یہ شعر

غنی چوں زوصف آں جہاں پرور است
بمقصود باز آمدن بہتر است

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس شعر میں "غنی" تخلص کے طور پر نظم نہیں ہوا ہے بلکہ معناً آیا ہے، اس سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ نکالا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ "جنگ نامہ" محمد طاہر غنی کشمیری یا کسی اور غنی کا ہو سکتا ہو، خود اسی "جنگ نامہ" میں ذرا آگے چل کر شاعر نے اپنا تخلص بھی باقاعدہ طور سے ظاہر کر دیا ہے، "باز آمدن بسر مدعا" کی سرخی کے ماتحت شاعر نے کلام کی ابتدا یوں کی ہے ؎

بیا یوسف از ہزل در کش عنان
حکایت کن از تیغ و تیر و سنان

خاتمۂ کلام | غنی ایک رجحان اور ایک دور کی نمایندگی کرتے ہیں، اس دور میں خاک کشمیر سے بہت سے عالی مرتبت شاعر، عالم اور صوفی ابھرے، افسوس ہے کہ یہ دور بڑی تاریکی میں پڑا ہوا ہے، اور اس پر بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ چونکہ یہاں کے شعراء اور علماء سنسکرت روایات سے بھی قریب تر تھے، اس لیے انھوں نے فارسی کو اور فارسی کی وساطت سے ان تمام ملکوں کو جہاں فارسی بولی اور سمجھی جاتی ہے، بہت کچھ دیا ہے، ان کی یہ دین یاد رکھنے کی چیز ہے، اور امید ہے کہ اہل ہند علی العموم اور اہل کشمیر علی الخصوص اس دور کو مزید تحقیق و تفتیش کا موضوع بنائیں گے، اور آنے والی نسلوں کو اپنے صالح اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرائینگے، میں نے اس کتاب کے دوسرے حصہ فکر غنی میں اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس سے نہ صرف غنی بلکہ اس عہد کے پورے شعری سرمایہ اور "سبک ہندی" کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

الہ آباد (۳)

از جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکھنؤ یونیورسٹی

(۳)

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ملک میں سیاسی انقلاب کے ساتھ لسانی انقلاب بھی آیا، فارسی جو ابتک نہ صرف سرکاری زبان بلکہ خواص کی بول چال اور ادیبوں کی تصنیف و تالیف کی زبان بھی تھی، رفتہ رفتہ غیر مقبول ہونے لگی، اور اسکی جگہ ملک میں ایک نئی ابھرتی ہوئی زبان ہندستانی، ریختہ یا اردو لینے لگی، وہ ادیب و شاعر جو ابتک صرف فارسی کو ذریعہ اظہار خیال بنائے ہوئے تھے، اردو کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگے، اور ملک کے دوسرے ادبی مرکزوں کی طرح الہ آباد میں بھی اس دور میں اردو نے فارسی کی جگہ لینا شروع کر دی، چنانچہ یہاں بھی اردو نثر نگاروں سے پہلے شاعر نظر آتے ہیں جن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انھیں پانچ دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا دور اٹھارہویں صدی کے نصف اول پر مشتمل ہے، اس دور میں الہ آباد میں صرف دو شاعروں کا پتہ چلتا ہے، جو فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے، ان میں پہلے عمدۃ الملک انجام ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، وہ شمالی ہند کے ابتدائی دور کے اردو شاعروں میں تھے، اور ان کے کچھ اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں،[1] لیکن ان میں سے بعض ایسے ہیں جنکی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بعد کے شاعر کا کلام ہے، جو انکے نام سے منسوب ہو گیا ہے، اس سلسلہ میں حکیم قدرت اللہ قاسم کی حسب ذیل عبارت بہت اہم ہے:-

"انجام۔ انچہ مشہور است تخلص امیر خاں بہادر پسر نواب بقاء اللہ خاں برادر نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر المخاطب بہ عالم خاں است اما از معتمدان بہ دریافت رسید کہ ایں تخلص نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم می کرد بہرکیف ایں یک شعر از صاحب ایں تخلص بہ من رسید۔"

---

[1] مجموعہ نغز ص ۸۰ - گلزار ابراہیم ص ۱۳ - ۱۴ - گلشن سخن ص ۵۱ - تذکرہ میر حسن ص ۹ - عمدہ منتخبہ ص ۲۳

اب یہی احسان ہے ہرگز نہ ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے اے صیاد ہم"

میر حسن نے مروان علی خاں مبتلا اور علی ابراہیم خلیل نے انجام کی اسی غزل کا ایک دوسرا حسب ذیل مطلع بھی نقل کیا ہے[۱]

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

ان کے علاوہ حسب ذیل اشعار بھی انجام سے منسوب ہیں :

ہم سوں چھپا کے اور سے آنکھیں ملا گیا
ظالم کسو کو مار کسو کو جلا گیا

خاکساری پر نہ کر موذی کے ہرگز اعتبار
جونک پانی میں رہے پھر بھی لہو پیتی رہے

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہرگز رفو
سوزنِ تقدیر بھی گر سو برس سیتی رہے

دور سے تکتے ہیں ساقی سن کے میخانہ کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانہ کو ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانندِ شرر جب کر چکے برباد ہم

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کی محبت دشمنی جانی ہوئی

اردو کے ابتدائی دور کے شاعروں کے انتخاب کلام کی ایک بیاض ان کی یادگار ہے۔

اس دور کے دوسرے شاعر جن کا الہ آباد سے کچھ تعلق ہے اسد یار خاں انسان ہیں جنکا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے[۲]، انکا نمونہ کلام یہ ہے:

عرب کو دیکھتا ہے ہند میں جو مت کا بھکا ہے
مدینہ ہے محمد آباد الہ آباد مکا ہے

زمین و آسماں اور مہر و مہ سب تجھ میں ہیں انساں
نظر کر دیکھ مشتِ خاک میں کیا کیا جھمکا ہے

الہ آباد میں اردو شاعری کا دوسرا دور ۱۷۵۰ء سے شروع ہو کر ۱۸۰۰ء پر ختم ہوتا ہے، اس دور کے شعراء کے کلام کے مجموعے بھی عموماً ناپید ہیں لیکن انکی شاعری کے نمونے مختلف تذکرہ نگاروں نے اپنی تصانیف میں محفوظ کر دیے ہیں، اس دور کے شاعروں کے کلام میں سادگی اور بیساختہ پن ہے، زبان صاف اور نرم ہے لیکن کہیں کہیں قدامت کی جھلک پائی جاتی ہے،

اس دور کے شعراء میں شاہ علیم الدین بیتاب (یا بقول میر حسن شاہ علیم اللہ بیتاب) سرفہرست ہیں[۳]، سرور کے بقول وہ "بزعم خود

---

[۱] مخزن نکات ص ۳۱، مجموعہ نغز ص ۱۱، گلشن ہند ص ۳۱، گلشن سخن ص ۶۸ [۲] تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۱، مجموعہ نغز ص ۱۲، عمدہ منتخبہ ص ۱۴۰، گلزار ابراہیم ص ۰۷

استاد وقت بود"، میر حسن انھیں "فاضل باکمال و عالم بے مثال" قرار دیتے ہیں، اور انھیں کے بیان کے مطابق بیتاب اپنے گھر پر مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے، قدرت اللہ قاسم بھی ان کی شاعری کے معترف تھے، چنانچہ لکھتے ہیں: "رویہ شعر گوئیش بسیار متانت بنیاد است"۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

جی کیونکہ بچے جبکہ جلاوے جگر آتش
سب بستی کو ڈر ہے جو لگے ایک گھر آتش

دل چھین لیا میرا بنارس کے بتوں نے
اس وقت میں تو اے میرے اللہ کہاں تھا

جب قرصِ مہ کا آئینہ لاتی ہے چاندنی
صورت کسی کی یاد دلاتی ہے چاندنی

رفتہ رفتہ بت خوش قد میرا آفت ہو گا
قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہو گا

نگیں کی طرز یہ کیا مجھکو سخت بھاتی ہے
کہ ایک نام کے خاطر جگر کھداتی ہے

شاہ بیتاب کے بیٹے شاہ محمد علی نجف بھی شعر کہتے تھے[۱]، مندرجۂ ذیل اشعار نمونۂ کلام ہیں

کس طرح ربط نہ ہو زلف سے دیوانوں کو
انس ہوتا ہے پریشاں سے پریشانوں کو

دل کو کہتا ہوں شاید اب سمجھے
پھر یہ خانہ خراب کب سمجھے

شیخ محمد رفیع رفعت بھی بیتاب کے ہمعصر تھے، اگرچہ انکا وطن الہ آباد تھا لیکن انھوں نے عظیم آباد میں بود و باش اختیار کر لی تھی[۲]، شیخ غلام قطب الدین مصیب کا ذکر فارسی گو شعراء کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، فارسی کے ساتھ وہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے، اور اردو و فارسی دیوان کے مصنف تھے[۳]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

سیاہ بخت کے گھر کون ہے جو لائے چراغ
مرے مزار پہ جلتا ہے دل بجائے چراغ

کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے
کہتے ہیں زلف کے کوچے میں صبا جاتی ہے

شکل کر پہنچے اس صنم کدہ میں دل مصیب
کیونکر سیاہی جائے زنگی کی بار میں

مصیب کے بھائی شاہ اجمل کا ذکر بھی ہو چکا ہے، وہ بھی فارسی کے ساتھ اردو میں شعر کہتے تھے، نمونۂ اشعار یہ ہے:

شاد تھا دل سب طرح سے بر میں جب جانانہ تھا
ہائے کیسی رات تھی جس رات وہ ہم خانہ تھا

---

[۱] عمدہ منتخبہ ص ۷۰، [۲] گلشن ہند ص ۱۳۶ [۳] تذکرہ میر حسن ص ۱۵۸، گلشن ہند ص ۲۳۶، گلشن سخن ص ۲۲۹

ہو گیا تھا کہتے کہتے ان دنوں میں ہوشیار
پھر جو دیکھا کل میں اے جل کر وہی دیوانہ تھا

خواجہ بخش اللہ قسمت الہ آبادی بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، مولف گلزار ابراہیم کے بیان کے مطابق ۱۱۹۰ھ (مطابق ۱۷۷۶ء) میں وہ عظیم آباد چلے گئے تھے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پھر الہ آباد واپس آگئے تھے[1]، مرزا الف بیگ فرصت، میر حسن اور سرور کے بقول الف بیگ فرصت الہ آبادی کے اجداد بیرونِ ہند سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے اور فرصت کی پیدائش الہ آباد ہی میں ہوئی، وہ خود سپاہی پیشہ تھے، ۱۱۹۶ھ میں انھوں نے اپنے اشعار کا انتخاب علی ابراہیم خلیل کو بنارس بھیجا تھا، خلیل اور میر حسن دونوں ان کے بے حد مداح ہیں، خلیل لکھتے ہیں کہ "الحال در الہ آباد نظیر خود ندارد"[2] میر حسن رقمطراز ہیں کہ "شاعر خوش تقریر، زبان دانِ دلپذیر، گوہر کانِ فتوت مرزا الف بیگ المتخلص بفرصت متوطن الہ آباد است، بندہ او را ندیدہ، مگر از یارانِ آن دیار شنیدہ کہ در آنجا مثلِ او کسے نیست فصیح بیان و شیریں زبان"۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

اس کو طرزِ جفا خوش آتی ہے
مفت میں اپنی جان جاتی ہے

اک عمر خاکِ کوئے بتاں سجدہ گاہ کی
تب رفتہ رفتہ اس بتِ کافر سے راہ کی

شاکی ہیں تیرے ظلم کے ہاتھوں سے کتنے یار
اپنا ہی سخت جی ہو کہ ہرگز نہ آہ کی

شمشیر کھینچ قاتل آیا جو میرے سر پر
مرنے کی آرزو میں گردن میں اپنی خم کی

فرمایا تب یہ اُس نے اے کشتۂ محبت
مہلت ہے اک ساعت کر شرح اپنے غم کی

میں نے کہا کہ یہ غم وہ غم ہے جس کے لکھتے
کاغذ کی چھاتی پھاٹی کٹ گئی زبان قلم کی

میں کس طرح سے تجھکو احوالِ دل سناؤں
جی میں ہزار باتیں فرصت ہے اک دم کی

منشی سداسکھ لال نثار دہلی کے باشندے تھے لیکن الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، ہمو کے شاگرد تھے، کئی دیوانوں اور ایک مثنوی کے مصنف ہیں[3]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے
تو شکوہ ہمیں کچھ تمھارا نہیں ہے

---

[1] گلزار ابراہیم ص ۲۲۵ [2] ایضاً ص ۱۸۸، تذکرہ میر حسن ص ۱۲۴ و ۱۲۵ ۔ عمدہ منتخبہ ص ۴۵۶
[3] چراغ محفل فصاحت ص ۵۰

کیا سنگھار رجھانے کو تم نے کس کے چشم
کر بال بال دُرِ اشک جو پرو دئے ہیں

بھکاری لال عزیز (بقول بعض تذکرہ نویسوں کے بھکاری داس عزیز) کا ذکر بھی فارسی گو شعرا کے ضمن میں ہو چکا ہے، مردان علی خاں مبتلا انھیں اردو میں میر درد کا شاگرد لکھتے ہیں[1]، اور ان کے بقول حقیقتاً ان کا وطن دہلی تھا لیکن وہ خود الہ آباد میں مقیم ہو گئے تھے، نمونۂ کلام یہ ہے:

کرے نیاز اگر دل کو صاف کینہ سے
عزیز موت بھلی پھر تو ایسے جینے سے

ملیں کیونکر بھلا اس شوخ طفل لاابالی سے
کہ سوتے سوتے چونکے ہے تصویر خیالی سے

ایسا ہے لعل لب کا تیرے یار رنگ سرخ
یاقوت جس کے آگے لگے ایک سنگ سرخ

شیخ غلام علی مرتضیٰ جنون ابن شاہ تیمور ہمسرامی مولوی برکت کے شاگرد اور مرد درویش صاحب کمالات ظاہری و باطنی تھے، عمر کے آخری حصہ میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے اور مستقل الہ آباد میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، سرور نے انکا شمار اساتذہ میں کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں، "اکثر شعرائے آنجا استفادہ از وحاصل می نمایند"۔ انکی طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی، ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے[2]، نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

مرا یار میرے ہی دل میں تھا ولے مجھکو بے خبری رہی
پھرا کوہ و دشت میں ڈھونڈھتا میرے شیشہ ہی میں پری رہی

وجود اس جہاں کا عدم دیکھتے ہیں
عجب خواب ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں

مٹے ہے تبھی پیچ و تاب اپنے دل کا
جب اس زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

کہنی نہ تھیں جو باتیں وہ تو نے سب کہی ہیں
کب چھپتی ہیں وہ آنکھیں جو جاگتی رہی ہیں

آفتِ جاں ہو گئی آخر یہ بینائی مجھے
جو بلا دیکھے وہ ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے

غلام حسین محزون (بقول صاحب گلزار ابراہیم سید محمد حسین محزون) اگرچہ فارسی گو شاعر تھے، لیکن کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، انکا وطن دلی تھا لیکن بہ سلسلۂ تعلیم الہ آباد آئے اور یہیں مستقل طور سے مقیم ہو گئے تھے، میر حسن انکے نہایت مداح ہیں، انھیں عالمِ بے نظیر و فاضل خوش تقریر، مبارز میدان دلائل، چابک سوار عرصۂ فضائل"

---

[1] گلشن سخن ص ۱۹۰، [2] گلزار ابراہیم ص ۱۰۱، عمدہ منتخبہ ص ۱۸۸

قرار دیتے ہیں[1]، محزوںؔ بھی مولوی برکت کے شاگرد تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

صنم اگرچہ میں بختِ سیاہ رکھتا ہوں
ہر طرح تیری زلفوں سے راہ رکھتا ہوں

زمیں پر مت پٹک اسکو نہ ہو یہ سنگ نہ سل ہے
ارے او بے مروت یہ کسی کمبخت کا دل ہے

کوئی نہ منع کرو اس کو مے پرستی سے
ابھی یہ نام خدا عالم جوانی ہے

یہ نہیں ممکن کرے زاری دلِ ناکام کم
گرچہ آنکھوں میں نہیں باقی ہے بہرِ نام نم

جب سے دل اٹکا ہے زلفوں میں نہیں کرتا ہے آہ
صید کو لینے نہیں دیتا یہ کافر دام دم

بات کہنا غیر سے اور دیکھنا ہر دم ہمیں
سب سمجھتے ہیں پیارے یہ تری ایہام ہم

کاظم علی مفتونؔ بھی اسی دور کے الٰہ آباد کے شاعر ہیں، جن کا ذکر سرورؔ، میر حسنؔ اور لطفؔ نے کیا ہے، لیکن ان کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہوئے[2]، عموماً رباعی کہتے تھے، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

ارکانِ زمانہ مختلف سب ہیں دلا
ان کی ترکیب سے عبث ہے یہ گلا
سارے عالم کی خاک چھانی یوں ہی
ایک اپنا زمانہ میں موافق نہ ملا

شکایت کیا رقیبوں کی کروں اس لاابالی سے
سمجھتا ہی نہیں کچھ نیک و بد وہ خورد سالی سے

ڈوبا دن اور اضطرابی آئی
مفتونؔ کیا شبِ غم شتابی آئی
جوں توں یہ پہاڑ سا تو کاٹا دن
پھر رات ہوئی بڑی خرابی آئی

معین الدین خاں معینؔ کا ذکر بھی سرورؔ اور قاسمؔ نے اسی عہد کے شعرائے الٰہ آباد میں کیا ہے، وہ انھیں مرزا رفیع سوداؔ کا شاگرد بتاتے ہیں، اور ان کی شیریں کلامی کے معترف ہیں، معینؔ آخر عمر میں عظیم آباد چلے گئے تھے[3]، نمونۂ کلام یہ ہے:

اے ابرِ بہاری شبِ ہجراں میں خبردار
دامن تیرا اس آگ کے شعلہ سے نہ بھڑکے

[1] تذکرہ میر حسن ص ۱۵۸، گلزار ابراہیم ص ۲۲۱ [2] تذکرہ میر حسن ص ۱۵۹ و ۱۶۰، عمدہ منتخبہ ص ۴۷۲، گلشن ہند ص ۲۲۶ مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۲۰۴ [3] عمدہ منتخبہ ص ۶۸۰، مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۲۰۱

قمری ہے فدا باغ میں شمشاد کی دھج پر
ہم صدقے ہیں اے سروِ رواں تیری اکڑ کے

ہوں میں وہ دِوانا کہ بہار آنے سے پہلے
زنجیر میں رکھتے ہیں معینؔ مجھ کو جکڑ کے

اسی دور کے ایک دوسرے شاعر المتخلص بہ مبیّنؔ تھے، انکا ذکر میر حسنؔ نے کیا ہے، وہ اگرچہ بدایوں کے رہنے والے تھے لیکن عرصہ تک ان کا قیام الٰہ آباد میں رہا، میر حسنؔ انکی بد مزاجی کے شاکی ہونے کے باوجود انکی شاعری کے معترف ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"در کلامش شاعرانہ و طبع دقت پسندش بہ نکتہ چینی دیوانہ، اکثر با شعرائے معاصرین بحث دارد۔۔۔ لیکن باوجود ایں ہمہ خود آرائی و خود پسندی مثل او ہم صاحب طبع پیدا نیست، مثنوی و قصیدہ و ہجو ہمہ خوب [illegible]"[1]

نمونۂ کلام یہ ہے:

دیں جگہ تیری جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا تجھ بتِ بیباک میں ہم

نقشِ پا کی نمط اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

خوش ہم عریانی سے اپنے ہیں برنگِ بوئے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

نہ بھرے نالوں سے راتوں کو مبیّنؔ دن اپنے
آہ کب تک رہیں گے گردشِ افلاک میں ہم

راجہ شیو کمار وفاؔ (متوفی ۱۸۰۵ء) آصف الدولہ کے عہد میں وقائع نگاری کے عہدے پر فائز تھے، کڑے کے باشندے اور میر تقی میرؔ کے شاگرد تھے، فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہونے کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے[2]،

شاہ محمد وارث الٰہ آبادی المتخلص بہ وارثؔ، مصیبؔ الٰہ آبادی کے شاگرد اور فارسی و اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا[3]،

پڑا ہے سنگدلوں سے مقابلہ دل کا
نہ ٹوٹ جائے میں ڈرتا ہوں آبلہ دل کا

کیا آہِ ناتواں میری اس کو اثر کرے
اک عمر چاہیے کہ لبوں تک گزر کرے

[1] تذکرہ میر حسن ص ۱۶۵ [2] ہندو شعرا (مولفہ عبد الرؤف عشرت) ص ۱۲۶ [3] تذکرہ میر حسن ص ۱۹۴، گلزار ابراہیم ص ۲۹۹

ہم کو تو رند کہتے ہو پر آپ شیخ جی
کیا کچھ شکار کرتے ہو داڑھی کی آڑ میں

اس عمر تجھے چاہیے اس سیر کو وارث
عالم کا تماشا جو میں اک آن میں دیکھا

الہ آباد میں شاعری کے تیسرے دور یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۰ء میں سب سے اہم واقعہ یہاں شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کی آمد ہے، حکیم مہدی کے عروج کے زمانہ میں لکھنؤ کی فضا اپنے ناموافق پاکر ناسخ کئی بار لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد آئے اور شاہ ابو المعالی کے مہمان ہوئے، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں،

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

ناسخ کی آمد کا اثر شعرائے الہ آباد پر بہت گہرا پڑا، چنانچہ یہاں بھی انکا طرز مقبول ہونے لگا، اور ان کے اشعار میں سادگی، بیساختہ پن اور آمد کی جگہ نازک خیالی، نکتہ آفرینی اور آورد نے لے لی، اس عہد میں الہ آباد میں بہت سے اردو شاعر پیدا ہوئے۔ شاہ ابو المعالی عالی کا ذکر فارسی شعراء کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، انکے اردو اشعار کا نمونہ یہ ہے:

نور تجلی یہ نہیں موسی طور پہ ایسا جلوہ کہاں ہے
آکے ہمارے نور نظر نے پردہ میں دکھلائیں آنکھیں

خانہ خراب ہو اس چاہت کا دن کو چین نہ خواب ہے شب کو
آنکھ لگی ایک پل نہ ہماری جب سے تم نے لگائیں آنکھیں

اس دور کے ایک دوسرے شاعر شاہ کمال الدین کمال مانکپوری تھے، ان کے بزرگ شاہی منصبدار تھے، لیکن خود انھوں نے آغاز شباب ہی میں سلسلہ اویسیہ میں بیعت کرکے درویشی اختیار کرلی تھی اور لکھنؤ چلے آئے تھے، اور قلندر بخش جرأت سے مشورۂ سخن کرتے تھے،[1] نمونہ کلام یہ ہے:

دل کے ہر داغ کا ہو رنگ کچھ لے یار نیا
سیر کر تو بھی کہ پھولا ہے یہ گلزار نیا

میں بندہ کیوں نہ ہوں اس کی ادا کا
عیاں اس بت میں ہے جلوہ خدا کا

تو خواہی یا نہ خواہی گالیاں دے
ہمارا کام ہے دینا دعا کا

ہم کو صیاد نے رکھا جو قفس میں تو آہ
دست شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پر رکھا

بوسہ لبوں کا مجھکو دیگا کہ گال کا
کچھ تو جواب دیجئے میرے سوال کا

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۹۰، عمدہ منتخبہ ص ۲ ۔ ۵۰۱، مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۱۴۲

اسی عہد کے کڑہ مانک پور کے ایک شاعر امیر الدین شاغل تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے،[1] درج ذیل شعر ان کے کلام کا نمونہ ہے،

بیقراری سے مری آہ وہ آگاہ نہیں
جس کا میں چاہنے والا ہوں اسے چاہ نہیں

شاغل کے ایک دوسرے ہم عصر و ہم وطن مرزا علی رضا رضا تھے، جو طبابت پیشہ تھے، اور کبھی کبھی شوقیہ شعر کہہ لیا کرتے تھے،[2] ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے،

خود نمائی کا اگر شوق ہے تجھ کو پیارے
پس رضا اپنے کو دکھلانے بہار دامن

مرزا اعظم علی اعظم (پیدائش ۱۸۰۰ء) الہ آباد کے باشندے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت بہت عرصہ تک آگرہ میں مقیم رہے، پھر پنشن لیکر وطن واپس آگئے، وہ آتش لکھنوی کے شاگرد تھے، خود ان کا شمار اساتذہ میں تھا، ان کا دیوان آگرہ سے شائع بھی ہو چکا ہے،[3] نمونۂ کلام یہ ہے

کوئی کر سکا دل نہ اپنا لہو
مرا ساتھ برگ حنا نے دیا

خنجر کا نہ بسمل ہوں نہ شمشیر جفا کا
انداز کا مقتول ہوں کشتہ ہوں ادا کا

ساقی نے دیا جام مے بے خبری کا
اب ہوش ہے شیشہ کا نہ شیشہ کی پری کا

خیال جاناں میں جان دینا خیال حسن حسیں میں جینا
ان ہی سے رغبت ان ہی سے الفت ان ہی میں مرنا ان ہی میں جینا

برق کیوں چمکی سبب کیا سیل کی بنیاد کا
گھر بنا بھی تو نہیں مجھ خانماں برباد کا

آنکھوں کی آرزو پہ ذرا کیجئے نگاہ
یہ چاہتی ہیں آپ کی تصویر دیکھنا

کعبہ کو نہ چھوڑیں گے نہ ہم دیر کے در کو
اک روز ادھر جائیں گے اک روز ادھر کو

حوصلہ دنیا کا زر کے ساتھ ہے
طاقت پرواز پر کے ساتھ ہے

میر جعفر تابش، ان کا وطن الہ آباد تھا لیکن غدر سے بیس پچیس سال پہلے دلی میں منتقل ہو گئے تھے، ان کے زیادہ حالات نہیں ملتے،[4] نمونۂ کلام یہ ہے

---

[1] چراغ محفل فصاحت ص ۵۳ [2] مجموعہ نغز ص ۲۷۲، عمدہ منتخبہ ص ۳۰۱ [3] خمخانۂ جاوید، ج ۱ ص ۲۳۳ [4] ایضاً ج ۲ ص ۲۲

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے   تو بہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو پرائے تابتیں   وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

شاہ غلام اعظم افضل شاہ ابو المعالی عالی کے بیٹے تھے، فارسی شعراء کے ضمن میں ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اردو میں اپنے والد کے دوست شیخ ناسخ سے اصلاح لیتے تھے، ان کی تصانیف میں چار دیوان[4] اور ایک مثنوی کا پتہ چلتا ہے[1]، نمونۂ کلام یہ ہے:

غربت میں مجھے جوں ہی خیالِ وطن آیا   ہونے لگی پاؤں پہ مرے گردِ سفر بار
ہے یقیں نورِ بصارت ہو زیادہ افضل   سرمۂ خاکِ مدینہ لگے گر آنکھوں میں
جینے نہیں دیتی ہے مجھے چاہ کسی کی   آئے مجھے آئی ہو جو اللہ کسی کی
پھوٹیں مری آنکھیں جو کسی اور کو دیکھوں   ناحق نہ سنا کیجئے افواہ کسی کی
جی جائے جگر کٹ ہے ہو پھٹ جائے کلیجہ   کیا تجھ کو خبر اے بتِ گمراہ کسی کی
وہ لبِ جاں بخش اک میں زار کس کا ہو رہوں   وہ مسیحا ایک میں بیمار کس کا ہو رہوں
یہ شرارے ہیں کہ آتے ہیں نظر آنکھوں کیا   ساتھ اشکوں کے نہیں لختِ جگر آنکھوں میں

شاہ ابو المعالی کے بھانجے سید محمد اکبر قدسی بھی الہ آباد کے ممتاز شاعروں میں تھے، وہ آتش لکھنوی کے شاگرد اور صاحبِ دیوان شاعر تھے[2]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

یاد آتی ہیں کافرجو ملاقات کی راتیں   کہئیے کسی عنوان نہیں برسات کی راتیں
تیری بلائیں نہ لیں پاؤں بھی نہیں والے   یہ ہم سمجھتے ہیں بیکار ہیں بدن میں ہاتھ

اشرف حسین اشرف الہ آباد کے رہنے والے تھے، اور مہدی حسین تصدیق سے اصلاح لیتے تھے[3]، حسب ذیل شعر ان کے کلام کا نمونہ ہے:

---

[1] خمخانۂ جاوید، ج اول ص ۳۶۰، چراغ محفل فصاحت ص ۵۴ [2] چراغ محفل فصاحت ص ۵۸ [3] ایضاً ص ۵۴

ہے چرخ پر کبھی تو کبھی کوہ و دشت میں   کچھ نہیں مقام ہمارے غبار کا

سید اصغر علی اصغر کا آبائی وطن بہار تھا لیکن یہ خود الہ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں وکالت کرتے تھے[1]، حسب ذیل شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہے:

جوڑے پہ ہوا رشک کہ ہو نافۂ تاتار   میں زلف کو سمجھا کہ یہ مشکِ ختن ہے

سید پرورش علی سخی کڑے کے باشندے اور سید جلال بخاری کی اولاد میں تھے، ۱۲۲۸ھ (مطابق ۱۸۱۳ء) میں پیدا ہوئے، اور پینسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۹۳ھ (مطابق ۱۸۷۶ء) میں وفات پائی، اردو کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے، آنوز تخلص تھا، ان کے دو اردو دیوان طبع ہو چکے ہیں[2]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

دل کھلونا نہیں جو کہتے ہو   ہم ہی لیں گے ہم ہی لیں گے
جمع خاطر رہے اے اہلِ قبور   ہم بھی آتے ہیں نہ گھبرائیے گا
بوسہ لِلّٰہ سخی مانگتا ہے   ایک دیجئے گا تو دس پائیے گا
ہنس کے بولے یہ سخی کی قبر ہے   جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے.

ان شعراء کے علاوہ انیسویں صدی کے نصف اول میں کچھ اور بھی اردو شاعر گزرے ہیں، جن میں سید علی اکبر ہاشمی، منشی موتی لال خبل، مرزا محمد بیگ مرزا، مولوی نصیح اللہ قائل اور میر محمد میر نجات اکمل قابل ذکر ہیں، آخر الذکر فارسی کے نثار اور شاعر بھی تھے، ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے،

(باقی)

---

[1] چراغ محفل فصاحت ص ۵۵ [2] خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۴۵

ٹونک کے کتب خانے

از جناب حکیم محمد عمران خاں صاحب ٹونکی

(۲)

تعلیم و تدریس اور علمی و تصنیفی مشاغل کے لیے کتب خانے لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اسلیے مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں بکثرت بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے، اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو ٹونک کی چھوٹی سی ریاست نے بھی بڑا کام کیا ہے، بے شمار نادر و نایاب کتابیں دنیا کے گوشہ گوشہ سے کھنچکر اس ریاست میں پہنچیں، امرا، رؤسا اور علما نے کتابوں کے ذخیرے جمع کیے جس کے آثار آجتک گھر گھر میں باقی ہیں، یہ اور بات ہے کہ آنے والی نسلوں نے اس کی قدر نہیں کی اور اکثر ذخیرے نا اہلی کے نذر ہو گئے، لیکن اس تباہی و بربادی کے باوجود آج بھی ٹونک کے ہر گھر میں کچھ نہ کچھ کتابیں مل جائیں گی، اور ایسی ایسی نادر و نایاب کتابیں آئے دن کوڑیوں کے مول فروخت ہوتی رہتی ہیں جنھیں دیکھکر صدمہ ہوتا ہے، آج ٹونک کے ان ہی ذخائر پر تفصیلی نظر ڈالی جائے گی۔

ریاست ٹونک کے قیام کے بعد، بانی ریاست نواب میر خاں کا دور[1] بالکل ابتدائی تھا، اسی لیے گو اس وقت یہاں باقاعدہ کتب خانے قائم نہیں ہوئے تھے لیکن ریاست کا وہ تاریخی کتب خانہ قائم ہوچکا تھا جو بعد میں "نواب وزیر الدولہ کے کتب خانے" کے نام سے مشہور ہوا جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آرہا ہے، اسی ابتدائی دور میں مختار الدولہ محمود خاں کا کتب خانہ بھی نادر و نایاب کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا، اسی طرح مولانا خلیل الرحمن کا کتب خانہ، درسی وغیرہ درسی کتابوں کی بڑی تعداد پر مشتمل تھا۔

[1] از ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء تا ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء

نواب میر خاں کے انتقال کے بعد نواب وزیر الدولہ کا دور[1] ریاست کی ترقی اور علمی عروج کا سنہری دور تھا، اس دور میں چونکہ بیشمار علمی خاندان منتقل ہوکر اس ریاست میں آباد ہوئے، اس لیے کتابوں کے ذخیرے بھی کافی تعداد میں مختلف خاندانوں میں جمع ہوئے اور یہ چھوٹی سی ریاست علم و فن کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ نادر و نایاب کتابوں کا مخزن بھی بن گئی۔

نواب وزیر الدولہ کے بعد نواب محمد علی خاں[2] نے اس چمن کی آبیاری کی، اگرچہ آپ کو کل ساڑھے تین سال حکومت کرنے کا موقع ملا[3]، اس کے باوجود انھوں نے ایسی راہیں نکال دیں اور ایسے وسائل پیدا کردیے جن سے یہ علمی خزانے معمور اور ان کے جواہر پارے محفوظ ہوگئے، علمی خاندانوں کے ذخیروں میں بھی اضافہ ہوا اور آہستہ آہستہ ٹونک کتابوں کا ایک بڑا مخزن بن گیا۔

یہ کتب خانے چار قسموں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

(۱) ریاستی کتب خانے (۲) امرا کے کتب خانے (۳) علما کے کتب خانے (۴) درسی کتب خانے۔

ریاستی کتب خانے ریاستی کتب خانوں میں، ٹونک میں صرف دو بڑے کتب خانے تھے[4]:

(۱) نواب وزیر الدولہ کا کتب خانہ (۲) نواب محمد علی خاں کا کتب خانہ۔

وزیر الدولہ کا کتب خانہ یہ کتب خانہ دراصل نواب امیر خاں کا قائم کردہ تھا لیکن نواب وزیر الدولہ نے اسے بڑی ترقی دی اور اس میں بڑا اضافہ کیا، اس لیے ان کے نام سے مشہور ہوا۔ قیام ریاست کے بعد جب جدید آبادی قائم ہوئی اور قدیم قلعہ میں شاہی محلات کی تعمیر شروع ہوئی تو ان محلات کے ساتھ کتب خانہ کیلئے بھی علحدہ عمارت تعمیر ہوئی اور علمی و فنی نوادر کتب خانہ میں جمع ہونا شروع ہوئے، دیوان شمس الدین کے والد مولوی سراج الدین صاحب

[1] از ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء تا ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء [2] از ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء تا ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء [3] اس کے بعد آپ معزول ہوکر بنارس تشریف لے گئے اور باقی عمر وہیں گذاری، تیس سال وہاں قیام رہا، ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں بنارس ہی میں انتقال ہوا [4] ان دونوں کتب خانوں پر ایک مضمون "ٹونک کے دو قدیم کتب خانے" مرتبہ مولوی منظور الحسن صاحب برکاتی، معارف جلد ۸۴ شمارہ نمبر ۲ بابت اگست ۱۹۵۹ء میں شائع ہوچکا ہے۔

اس دور کے باا ثر افراد میں شمار کیے جاتے تھے، اس کتب خانہ سے بھی متعلق تھے، متعدد کتابیں آپ کے قلم کی لکھی ہوئی عبد الرحیم خاں کے کتب خانہ میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی عبد الکریم صاحب عسکری خوشنویس، مولوی فضل حق صاحب خطیب اور شیخ محمد یعقوب صاحب صدیقی داروغہ اس کتب خانہ کے نگران رہے ہیں۔ یہ کتب خانہ ۳۶۱۶ کتابوں پر مشتمل تھا، ان میں ۲،۸۰۷ قلمی کتابیں تھیں اور باقی مطبوعہ، اس کتب خانہ کو حکومت ہند نے مولانا آزاد مرحوم کی معرفت ۱۹۵۴ء میں خرید لیا، اس طرح یہ کتب خانہ انڈین نیشنل لائبریری دہلی میں ضم ہوگیا[1]، چونکہ اس کتب خانہ اور اسکے نوادر پر تفصیلی مضامین لکھے جاچکے ہیں اس لیے اس کی مزید تفصیل لکھنے کی ضرورت باقی نہیں ہے،

نواب محمد علی خاں کا کتب خانہ

یہ کتب خانہ مختلف زمانوں میں "کتب خانہ محمد علی خاں"، "عبد الرحیم خاں کا کتب خانہ"، "سعیدیہ لائبریری ٹونک"، "ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک" اور "اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ ٹونک" کے ناموں سے متعارف رہا ہے۔ نواب محمد علی خاں اس کے بانی و مربی تھے، ان کے بیٹے صاحبزادہ عبد الرحیم خاں نے اس میں کافی اضافہ کرکے اس کی شان دوبالا کی، نواب سعادت علی خاں نے اپنے تخلص "سعید" کی مناسبت سے اسے سعیدیہ پبلک لائبریری کا نام دیا، حکومت راجستھان نے ۱۹۵۶ء میں اسے ڈسٹرکٹ لائبریری بنا دیا اور اب ۱۹۶۱ء سے قلمی و مطبوعہ کتب کی تقسیم کی وجہ سے اسکے دو حصے ہوگئے، قلمی کتابیں اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ ٹونک کی نگرانی میں ہیں اور مطبوعہ کتابیں، حسب سابق سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری، اسمٰعیل بلڈنگ میں محفوظ ہیں، اس کتب خانہ کے قلمی و مطبوعہ ذخائر کی مفصل فہرست تیار کرنے کا فخر راقم کو حاصل ہوا، اسکے قلمی شعبہ پر صاحبزادہ شوکت علی خاں ایم اے کا ایک مضمون معارف جلد نمبر ۹۶ شمارہ نمبر ۳ بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس لیے مزید لکھنے کی ضرورت باقی نہیں ہے،

---

[1] اس کتب خانہ کے نوادر پر ایک مضمون "کتب خانہ وزیر الدولہ کے چند نوادر" مولوی حکیم محمود احمد صاحب برکاتی (نبیرہ حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی) نے لکھا تھا، یہ مضمون سہ ماہی رسالہ "بصائر" کراچی میں بماہ جولائی ۱۹۶۲ء شائع ہو چکا ہے۔

مطبوعہ شعبہ میں کتابوں کی تعداد درج ذیل ہے:

عربی ۲۹۸۳، فارسی ۱۴۶۴، اردو ۲۸۴۳، ہندی ۳۸۶۸، انگریزی ۸۰۷، پشتو ۶، پنجابی ۱، سندھی ۱ میزان ۱۱۹۷۳۔

یہ لائبریری ٹونک کی سب سے مقبول لائبریری ہے۔

کتب خانہ عدالت شریعت

قیام ریاست کے وقت سے اس ریاست میں عدالت شریعت قائم تھی، ابتدائی دور میں تمام مقدمات اسی عدالت میں ہوتے تھے، قتل و قصاص تک کے تمام مقدمات اسی عدالت سے فیصل ہوا کرتے تھے، انضمام ریاست تک یہ عدالت قائم رہی، اس لیے ضرورت کی کتابیں آہستہ آہستہ اس عدالت میں جمع ہوتی رہیں، مولوی احمد مجتبیٰ صاحب مفتی کا کتب خانہ بھی اسی عدالت میں شامل کردیا گیا، اس طرح کتابوں کا کافی ذخیرہ جمع ہوگیا، افتاء و قضا کے سلسلہ میں جن کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی بڑی تعداد اس میں موجود تھی، تقسیم ملک کے بعد یہ کتب خانہ بھی سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک میں شامل کردیا گیا تھا،

امراء کے کتب خانے

رؤساء و امراء کے کتب خانوں میں مختار الدولہ محمود خاں، دیوان شمس الدین اور نائب عبید اللہ خاں وغیرہ کے کتب خانے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ذیل میں ہر کتب خانہ کے متعلق کچھ تفصیل لکھی جاتی ہے،

مختار الدولہ کا کتب خانہ

مختار الدولہ محمود خاں[1]، نواب میر خاں کے ساتھیوں میں اہم ترین شخصیت کے تھے، علم دوست اور علم نواز بھی تھے، دیوان شمس الدین "واقعات ہفتدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر" میں آپ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

"عالمے، عابدے، واعظے، عاقلے، پارسائے، عادلے، طبیبے، شجاعے، درکار ملک و سپاہ مدبرے بود و ہمہ کارہائے متعلقہ نفس خود و سپاہ ہمراہی خویش را بر وفق آئین ہمین شرع بریں تمشی میکرد

---

[1] المتوفی ۸ رجمادی الاخریٰ ۱۲۵۹ھ

دسرانجام میداد ...... ودر اوقات فراغ از مشاغل سپاہ وملک بہ تحصیل علوم دینی و دنیوی و معالجات مرض از بیماران ہرگونہ امراض و بیمار یہا مشغول میشد و گاہے فحش نگفت ودشنام نداد۔"

آپ کا کتب خانہ مختلف علوم و فنون کی نادر کتابوں پر مشتمل تھا، یہ کتب خانہ مختار الدولہ کی اسی تاریخی عمارت میں واقع تھا، جسے موصوف نے ۱۲۳۷ھ میں ریاست کے ابتدائی دور میں تعمیر کرایا تھا، جسے قلعۂ ثانی کہنا بیجا نہ ہوگا، عمارت کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حویلی کے مختلف قطعات میں کئی مسجدیں اور کئی کنوئیں ہیں، وسیع دالانوں کے در و دیوار میں فن ہیئت و ریاضی کے نقشوں سے جو فنی و صنعتی مظاہرکیا گیا ہے، اس پر علیحدہ مضمون لکھا جا سکتا ہے، مختار الدولہ کے کتب خانہ میں علوم و فنون کی بیشمار کتابیں تھیں، افسوس اب یہ کتب خانہ باقی نہیں رہا، لیکن اس کی متعدد نادر کتابیں، سعیدیہ لائبریری ٹونک کے شعبۂ قلمی اور والد صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں ان کتابوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتب خانہ اہم بہترین علمی ذخیروں پر مشتمل ہوگا، کتب خانہ میں جو کتاب بھی داخل ہوتی تھی، اس کے پہلے صفحہ پر مہر ثبت کیجاتی، اور اس کے داخلہ کے سلسلہ میں ایک خوشخط نوٹ درج کیا جاتا تھا، اس کتب خانہ میں جلد سازی کا بڑا اہتمام تھا، جلد بندی میں بڑی صناعی سے کام لیا جاتا تھا، منح الغفار شرح تنویر الابصار کا ایک قدیم نسخہ والد صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس کتاب کی جلد کی دفتی پر جو کام کیا گیا ہے اس میں ۱۲۳۰ھ، کتاب کا نام اور مالک کتاب (مختار الدولہ) کا نام لکھا گیا ہے، یہ شرح خود ماتن کی تصنیف ہے، اس کے مصنف محمد عبداللہ العربی التمرتاشی نے ۹۹۵ھ میں تنویر الابصار تصنیف کی اور پھر خود ہی اسکی شرح لکھی ۱۰۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا، پیش نظر نسخہ ایک قدیم و نادر نسخہ ہے، جس کی تاریخ کتابت ۲۴ شعبان ۱۰۹۰ھ ہے، یہ کتاب مختار الدولہ محمود خاں کے کتب خانہ کا بہترین نسخہ ہے، اس کتب خانہ میں اسکی جلد بندی ہوئی اس کتب خانہ کی کتابیں ان کے پوتوں تک محفوظ رہیں، اس کے بعد برباد ہوگئیں،

دیوان شمس الدین کا کتب خانہ: دیوان شمس الدین، نواب وزیر الدولہ، نواب محمد علی خاں اور نواب ابراہیم خاں، تینوں رئیسوں کے دور میں ریاست کے اہم مناصب پر فائز رہے، مدار المہام ریاست بھی رہ چکے تھے، موجودہ صدی ہجری کی پہلی دہائی میں انتقال فرمایا، موصوف ملکی و مالی انتظامی قابلیت کے ساتھ علم و فن سے بھی شغف رکھتے تھے، دینی علوم سے بھی دلچسپی تھی، آپ کا کتب خانہ اسی ذوق کا نتیجہ تھا جو مختلف علوم و فنون کی سیکڑوں قلمی و مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا، بڑی اہم اور نادر کتابیں آپ کے کتب خانہ میں تھیں، آپ کے انتقال کے بعد کتب خانہ کا اکثر حصہ صاحبزادہ عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں منتقل ہوگیا جو اب سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک میں محفوظ ہے، اکثر کتابوں پر آپ کی مہر مع دستخط و تاریخ ثبت ہے، ان کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر کتاب آپ کے مطالعہ سے گذری تھی جس پر آپ کے قلم کے حواشی، آپ کے نوٹ اور مضمون کتاب کی سرخیاں شاہد ہیں، کتاب کے شروع میں کتاب اور مصنف کے حالات بھی اکثر اپنے قلم سے لکھے ہیں، خط نہایت پختہ و پاکیزہ، منشیانہ اور مطالعہ نہایت وسیع تھا، مولوی احمد علی صاحب شیاؔ "محامد علیہ" میں آپ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

"او مردیست خوش خلق، شیریں تقریر، در تواضع و وقار بے نظیر، در اجرائے قوانین بندوبست و ملک فکر رسا دارد، علم حدیث و تفسیر و سیر و اخلاق خوب بہ یاد گرفتہ، خود را بدین پایۂ بلند در صورت خاکساران دارد۔"

"نزہۃ الخواطر" میں ہے:- وکان سریع الادراک قوی الحفظ شدید الانہماک علی مطالعۃ الکتب والمذاکرۃ حریصاً علی جمع الکتب النفیسۃ، کثیر الاستحضار للمسائل العربیۃ، رأیتہ فی کبر سنہ فوجدتہ منھمکاً فی المطالعۃ لاسیما الکتب المصنفۃ لابن ابی شیبۃ[1]۔

دیوان صاحب کی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ علم و فضل کیساتھ بڑے علم نواز اور نادر و نایاب کتابوں کے بڑے قدردان بلکہ حریص تھے، مسجد قافلہ کے مقابل آپ کے مکانات تھے، ان ہی میں آپ کا کتب خانہ بھی تھا، یہ اب تک "دیوان جی کے گھر" کے نام سے معروف ہے۔

کتب خانہ نائب صاحب: نواب وزیر الدولہ کے بیٹے عبید اللہ خاں نائب الریاست اور اپنے عہد کے بڑی شان و شوکت کے رئیس تھے، ان کی حویلی اپنی شان کی نرالی عمارت ہے، ایک خوبصورت مدور کوٹھی نشستگاہ تھی، اسی کا ایک حصہ کتبخانہ کیلئے مخصوص تھا، انکے بیٹے صاحبزادہ عبدالحلیم خاں نے اپنے آخری دور تک اس یادگار کو قائم رکھا، مولوی محمود حسن خاں، صاحب معجم المصنفین کی آپ کے یہاں برابر آمد و رفت تھی اور وہ اس کتب خانہ کی بھی نگرانی فرماتے تھے، اسی دور میں مجھے یہ کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، کتابیں علیحدہ علیحدہ الماریوں میں قرینہ و سلیقہ سے جمی ہوئی تھیں، علوم شرعیہ اور تاریخ کی کتابوں کا زیادہ ذخیرہ تھا، قلمی اور نادر کتابیں بھی کافی تھیں،

---

[1] یہ نسخہ کتب خانہ ٹونک میں محفوظ ہے۔

ساتویں آٹھویں صدی ہجری کی مستند کتابیں تھیں، ریاست کے قیام اور اسکی تعمیر و ترقی کی تاریخ کا بھی اہم مواد اس میں موجود تھا، ابتدائی دور کے اہم مرقعے، قدیم عمارتوں کی ابتدائی تصاویر بھی تھیں، افسوس آج کتبخانہ کا وجود باقی نہیں، کتبخانہ کا اکثر حصہ بمبئی کے تاجر خرید کر لے گئے، کچھ دوسرے مقامات پر منتقل ہوا، باقی ذخیرہ بھی نا اہل اولاد کے ہاتھوں دست برد ہو کر منتشر ہو گیا۔

ان رؤسا کے علاوہ صاحبزادے محمود خاں کا کتبخانہ تھا جو انکے بعد انکی اولاد میں صاحبزادے محمد سعید خاں کے قبضہ میں رہا، جنھوں نے اپنے شوق کی کتابوں کا اضافہ کیا، لیکن اسکے نوادر بھی تلف ہونا شروع ہو گئے، کچھ نوادر اب بھی انکی اولاد کے قبضہ میں ہیں، پانچ سات سال قبل میں نے اس ذخیرہ کو دیکھا تھا، اسوقت متعدد قرآن مجید، حمائل، ظائف اور تاریخ کی متعدد مطلّی و مذہب نادر کتابیں موجود تھیں،

صاحبزادے اسحٰق خاں کا کتب خانہ بھی مختلف فنون کی نادر کتابوں پر مشتمل تھا، موصوف نواب محمد علی خاں کے سب سے بڑے بیٹے تھے، اسلیے کتب خانہ بھی انکو ورثہ میں ملا، بعد میں مزید اضافہ ہوتا رہا، انکے بیٹے صاحبزادہ سردار محمد خاں ریٹائرڈ کلکٹر سندھ نے بھی اسکو باقی رکھا، ۱۹۵۵ء میں مجھے اس کتبخانہ کی فہرست بنانے کا موقع ملا تھا، لیکن افسوس ہے یہ کتب خانہ بھی اب انقلاب زمانہ کی نذر ہو کر بمبئی کے تاجروں کے ہاتھوں فروخت ہو گیا۔

صاحبزادے عبد الحمید خاں کا کتبخانہ بھی اہم ذخیرہ پر مشتمل تھا، لیکن عرصہ ہوا یہ کتب خانہ بھی ختم ہو گیا اور مختلف لوگوں کے ہاتھوں کتابیں فروخت ہو گئیں،

صاحبزادے احمد خاں کا کتبخانہ بھی قابل ذکر ہے، مختار الدولہ محمود خاں جنکا ذکر پہلے ہو چکا ہے، انکی حویلی انکے بعد میں صاحبزادہ احمد خاں کے قبضہ میں آئی، موصوف نیک دل، نیک مزاج اور مخیر ہونے کے ساتھ علم دوست اور علم نواز بھی تھے، اسلیے کتابوں کا کافی ذخیرہ انکے کتبخانہ میں جمع ہوا، مگر اسکی سیکڑوں کتابیں خود انکی زندگی میں ضائع ہو گئیں، انکے انتقال کے بعد بچا ہوا ذخیرہ انکی اولاد میں تقسیم ہوا، انکے صاحبزادے حکیم عبد القیوم خاں صاحب نے اپنے حصہ کی کتابوں میں اضافہ کر کے ایک اچھا کتبخانہ بنا لیا تھا، یہ ذخیرہ اگرچہ اب کتب خانہ کی حیثیت سے باقی نہیں ہے، پھر بھی انکی اولاد میں محفوظ ہے، درسی و غیر درسی معمولہ کتابوں کے علاوہ قلمی کتابیں کافی تعداد میں ہیں، مگر اب عرصہ دراز سے گرد و غبار کے غلافوں میں مقفل و محفوظ کر دی گئی ہیں،

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں، از جناب عبد الرزاق قریشی، صفحات تقریباً ۲۰۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ بمبئی ۳،

اس سے پہلے مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے دو مجموعۂ مکاتیب شائع ہو چکے ہیں، (۱) رقعات کرامت سعادت اور (۲) کلمات طیبات، یہ مکاتیب پہلی بار شائع ہو رہے ہیں، چونکہ ان تمام مکاتیب کے لکھنے والے موصوف ہی ہیں، اس لیے بعض مکاتیب کے کچھ مضامین مشترک ہیں، اس مجموعے کے بیشتر خطوط قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں جو انکے سب سے محبوب شاگرد اور مسترشد تھے، یہ خطوط چونکہ ذاتی ہیں اس لیے زیادہ تر ان میں ذاتی اور نجی باتوں کا ذکر ہے، جن سے ان کی زندگی کے بہت سے نئے گوشے سامنے آجاتے ہیں، اور بہت سی مبہم باتیں واضح ہو جاتی ہیں، ذاتی حالات کے ساتھ قاضی صاحب کے خاندان سے مرزا جان جاناں کو جو انس تھا، اس کا ذکر بھی اس میں کثرت سے ملتا ہے، اسی کے ساتھ بہت سے خطوط سے اس دور کے بہت سے سیاسی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متعدد ارباب حکومت مثلاً نجیب الدولہ، مجد الدولہ وغیرہ سے مرزا صاحب کے گہرے تعلقات تھے، متعدد خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب گو ایک عزلت نشین بزرگ تھے مگر اپنے دور کے سیاسی حالات ہی سے نہیں بلکہ بعض دوسرے جزئیات سے بھی پورے طور پر باخبر تھے، اس دور کے معاشی حالات پر بھی ان خطوط سے اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، مثلاً ان کے دور میں گیہوں روپیہ سوا روپیہ من بکتا تھا، چھینٹ کا ایک تھان ایک روپیہ میں مل جاتا تھا، عینک آٹھ آنے میں ملتی تھی، مختصر یہ کہ

عبدالرزاق صاحب قریشی نے یہ مجموعۂ مکاتیب شائع کرکے ایک اچھی علمی خدمت انجام دی ہے، شروع میں قریشی صاحب نے ۲۷-۲۸ صفحے کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے، جو قابلِ تحسین ہے، آخر میں بطور ضمیمہ ان کی دو اور مختلف تحریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں، اور پھر تشریحات کے عنوان سے ان خطوط میں جو قابلِ ذکر اشخاص، واقعات اور مقامات وغیرہ آئے ہیں، ان کی تفصیل بھی دے دی ہے، اس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے، اس کی اشاعت سے مرزا صاحب کی زندگی کی ایک دستاویز ہاتھ آگئی۔

اخبار الاخیار ۔ از: شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ، صفحات ۵۲۳، کتابت وطباعت متوسط

ناشر دار الاشاعت مولوی مسافرخانہ بندر روڈ، کراچی ۱۲

یہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا مشہور فارسی تذکرہ اخبار الاخیار کا ترجمہ ہے، اس میں تقریباً تین سو علماء وصوفیہ کے حالات ہیں، آخر میں مجدد الف ثانیؒ اور خود مصنف کے حالات شامل کر دیے گئے ہیں،

پاکستان میں اردو ترجمہ کا کام جس تیزی سے ہو رہا ہے وہ قابلِ ستائش ہوتے ہوئے کچھ توجہ کا بھی محتاج ہے، کاش یہ ناشر حضرات ترجمہ کا کام ایسے قابلِ اعتماد لوگوں کے سپرد کرتے جو متضاد واقعات میں تطبیق اور بعض خرقِ عادت واقعات کی توجیہ کر سکیں، یا پھر ان کو حذف کر دیں، تاکہ موجودہ دور کے ادیت پسندوں کو خواہ مخواہ اہلِ دین سے وحشت نہ ہو، خاص طور پر صوفیہ کے تذکروں میں تو اس کیلئے شدید اہتمام کی ضرورت ہے، یہ ایک مسلم شیخ اور محدث وقت کا مرتب کردہ تذکرہ ہے، مگر اس میں بھی دسیوں خلافِ سنت واقعات یا تو حذف کر دینے کے قابل تھے یا پھر انکی توجیہ کی ضرورت تھی، امید ہے کہ دوسری اشاعت میں اسکی تلافی کی کوشش کیجائیگی، ان باتوں سے قطع نظر اس کا ترجمہ اور اشاعت بہرحال ایک مفید کام ہے۔

م ۔ ع

جلد ۹۸ ۔ ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء عدد ۴

مضامین